جدید
تاریخ ادب اردو
(خصوصی مطالعہ بہار)

جدید تاریخ ادب اردو

خصوصی مطالعہ (بہار)

مؤلفین

نکہت پروین ‖ ڈاکٹر آصف اختر

ناشر

جاوید بک سنٹر

بی. ایم داس روڈ پٹنہ۔۴

نام کتاب : جدید تاریخ ادب اردو (بہار)

مصنف : نکہت پروین و ڈاکٹر آصف اختر

ناشر : جاوید بک سینٹر

اشاعت : 2010

تعداد : 500

قیمت : 140/-

کمپوزنگ : کہکشاں سراج (اکسیلینٹ کمپیوٹر)

پٹنہ بک سینٹر

بی. ایم داس روڈ پٹنہ-۴

9334551758

فہرست

پیش لفظ

اردو ادب کے مختلف موضوعات پر تاریخی پس منظر میں فنی، صنفی اور ہیئتی اعتبار سے اس کی اہمیت و افادیت کو واضح کیا گیا ہے لیکن اس میں معیاری فنی نکات کی تلاش بے مقصد ہوگی کیوں کہ تمام موضوعات طالب علموں کے مفاد میں رکھ کر لکھی گئی ہیں تا کہ طلباء کو اس کتاب کے مطالعہ سے ادب کے موضوعات سے واقفیت حاصل کر سکیں اس کے مختلف مراحل و منازل سے کما حقہ واقفیت ہو جائے اردو زبان کی ابتداء کے مختلف نکات، غزل، افسانہ، ڈرامہ، تنقید وغیرہ موضوعات پر کئی کئی ہزار صفحے لکھے جا سکتے ہیں لیکن یہاں طالب علموں کے مفاد کو پیش نظر رکھتے ہوئے اختصار سے کام لیا گیا ہے جس کی وجہ کر بہت سے ایسے نکات کا سرسری جائزہ لیتے ہوئے نکل جانا پڑا ہے ادب کے ماہیروں سے گذارش ہے کہ متذکرہ مضامین کو اس پس منظر میں نہ دیکھ کر ایک طالب علم کی عینک سے دیکھیں جو ان کی ضرورتوں کو پورا کرنے کی سعی کی گئی ہے۔

ایک ناشر کی حیثیت سے جناب جاوید اختر اردو زبان و ادب کے فروغ و اشاعت میں ہمیشہ کوشاں رہتے ہیں ان کی علمی و ادبی شوق جنون کی حد کو پہنچتی ہوئی خصوصاً بہار کے ادبی ذوق کو زندہ جاوید رکھنے کی مہم چلا رہے ہیں۔

مضامین میں اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ کم سے کم فقروں جملوں میں ان تمام باتوں کو رکھ دیا جائے جو طالب علم کے ابتدائی علم کے لئے لازمی ہیں بہت سے ایسے بھی مضامین ہیں جن پر ماہرین ادب اپنے اپنے زاویہ نگاہ سے ادب کے مختلف موضوع کا تجزیہ، نکات کا اظہار کرتے ہیں میں ان تمام نکات وفکر سے اجتناب کرتے ہوئے صرف ذیلی افکار کو ہی پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہماری یہ کوشش کہاں تک کامیاب ہوئی اس کا احتساب قاری کے ہاتھوں ہے۔

نکہت پروین و ڈاکٹر آصف اختر

بہار میں اردو زبان وادب

بہار میں اردو زبان وادب کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی خود اردو کیونکہ جہاں اردو کی ابتداء سے متعلق کئی نظریے ملتے ہیں اسی طرح اختر اورینوی کا کہنا ہے کہ اردو کی ابتدا بہار سے ہوئی ہے اور اس کے ابتدائی نمونے بہار میں ملتے ہیں اس سلسلے میں انہوں نے جو شواہد پیش کیے ہیں اور جن حالات وجوہات کا ذکر کیا ہے اس کے مطالعہ سے قریب الحقیقت ہے کہ اردو زبان کی ابتداء بہار سے ہوئی ہے۔اس فکر میں کوئی شک نہیں کہ اردو زبان کی ابتداء ہندوستان کے کسی مخصوص خطے سے نہیں ہوئی ہے بلکہ اس کا خمیر ملک کے مختلف علاقوں میں پائے جاتے ہیں۔

بہار میں اردو زبان وادب کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہیں تو پاتے ہیں کہ دہلی اور دکن میں اردو زبان پر طبع آزمائی ہو رہی تھی اسی وقت بہار کے صوفی بزرگوں کے کنج مندرے اور ملفوظات کے نمونے بھی ملتے ہیں۔تحقیق اور تجسس کی نگاہ اس دیار تک پہنچتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ مقامی زبان مگدھی، پراکرت، میتھلی، مگہی، بھوجپوری وغیرہ زبانیں جو بہار کی خاص مقامی زبانیں ہیں اردو بھی ان ہی گروہ میں شامل نظر آتی ہے گروہ کے دیگر زبانوں سے قطع نظر اردو کی طرف رخ کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ حضرت خواجہ شرف الدین احمد منیری کے دوہے کا ذکر عبدالحق اپنی کتاب "اردو کے نشو نما میں صوفیائے کرام کا حصہ" میں درج کیا ہے۔اردو زبان اس دور کی پیداوار ہے جب دوسری جدید ہند آرائی زبانیں اپ بھرنشو سے پیدا ہو رہی تھی اردو بھی اسی جدید ہند آرائی دور کی پیداوار ہے لیکن دوسری جدید ہند آرائی زبان کے مقابلہ میں اس کی تخلیق زیادہ مرکب، پیچیدہ، بالیدہ اور ارتقا یافتہ انداز میں ہوئی ہے اسطرح ہم دیکھتے ہیں کہ خواجہ بہاری کے زمانہ میں سدھیوں مثلاً بروپا اور لوہی بودھ سدھیوں نے جو دوہے تحریر کئے ہیں اس میں عربی وفارسی کے الفاظ بہاری اپ بھرنس سے ملی ہوئی ہے صوفی بزرگ ملاّ محمد رمضان کی نظم "آخرت نامہ" حضرت مظفر بلخی کے دوہے وغیرہ صوفیو کے ابتدائی نمونے ملتے ہیں۔

بہار میں اردو ادب بیرونی یا مصنوعی نہیں بلکہ مقامی اور اصل ہے بہار والے اپنے مذاق شاعری میں کسی کے محتاج نہیں بلکہ آپ اپنا مقلد و شاگرد ہیں جب اردو زبان بہار میں بالیدہ ہوگئی تو وہ از خود اسی صوبہ کی مٹی سے وٹامن لیکر اسی کے پانی سے سیراب اور اسی کی ہوا سے شاداب ہو کر پھولنے پھلنے لگی اور اس کے ادب کی خوشبو ملک کی فضا میں پھیلی اور سامان نشاط و مسرت بنی۔معین الدین دردائی فرماتے ہیں۔

بعض لوگوں کا یہ حال ہے کہ بہار کی شاعری کا کوئی خاص اسکول نہیں ہے بلکہ دہلی اور لکھنؤ اسکول

کی پیروی ہے لیکن اس کی تاویل کیوں کر کی جائے گی کہ اگر اشتی اور جماتی نے خواجہ میر درد کو اپنا استاد بنایا تو میر تقی میر نے بھی جعفر عظیم آبادی کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا۔ ان کے علاوہ غالب نے بھی مرزا بیدلؔ عظیم آبادی کا کلام سامنے رکھکر مشق سخن کی"۔ مرزا عبدالقادر بیدلؔ عظیم آبادی عہد عالمگیر میں دہلی گئے پھر عظیم شاہ کے زمانے میں پٹنہ آئے فارسی کے شاعر تھے لیکن اردو میں بھی شاعری کرتے تھے۔

اس دل کے آستان پر جب عشق آپکارا
پردے سے یار بولا بیدلؔ کہاں ہے ہم میں

سید عمادالدین قلندر پھلواری صوفی بزرگ تھے یہ اردو کے شاعر تھے ان کی غزلیں اور رباعیات معارفت میں ڈوبی ہوئی ہیں ملا محمد تحقیق عظیم آبادی فارسی واردو میں شاعری کرتے تھے بہار میں اردو شاعری کے ابتدائی دور میں بزرگان دین کا ایک اہم رول رہا ہے مثلاً قاضی عبدالغفار غفاؔ، غلام نقش بند سجاد، حضرت بی بی ولیہ، لالہ اجاگر چند الفتؔ، مہاراجہ رام نرائن موزوں اور گونا گوں خصوصیت کے صوفی شاعر شاہ آیت اللہ جوہری و مذاقی پھلواری اردو و فارسی دونوں زبان میں شاعری کرتے تھے یہ فارسی میں شوزشؔ تخلص کرتے تھے۔ انہوں نے مرثیہ وسلام میں طبع آزمائی کی ہے ان کی سب سے زیادہ مشہور مثنوی ''گوہر جوہری'' اردو ادب میں خاصہ مقام رکھتی ہے۔ ان کے ہمعصر نور محمد دلدار میر وارث علی نالاں حسرتؔ میر محمد رضا شاہ نور الحق طپاں پھلواری اور غلام علی راسخ عظیم آبادی شاہ ظہور الحق، ظہور پھلواری شاہ ابوالحسن فرد اور قادر علی نگار کلیان سنگھ عاشقؔ وغیرہ شاعری ونثر نگاروں کے یہاں صوفیانہ اور مذہبی رنگ غالب ہے۔ مرثیہ تو جذبات عقیدت سے بھرے ہوئے ہیں غزل اور مثنوی میں بھی عارفانہ میلان نمایاں ہے نثر نگاری پر بھی مذہبیت طاری ہے ناصحانہ، واعظانہ، اور مباحثانہ نثر رسالوں میں ملتے ہیں داستان اور قصے بھی لکھے گئے ہیں۔

شادؔ عظیم آبادی نے تو بہار میں شاعری اور نثر نگاری کی جڑیں اس قدر مضبوط کر دیا کہ پوری اردو دنیا محو حیرت ہے فضل حق آزاد نے اردو نظم کو وہ معیار عطا کیا کہ بہار میں اردو زبان وادب کی فضا آفرینی میں شمار کئے جانے لگے اخترؔ اورینوی، جمیل مظہری، قاضی عبدالودود، کلیم الدین احمد عبدالمغنی سہیل عظیم آبادی، بسمل عظیم آبادی، رمزم عظیم آبادی، شمیم پھلواری وغیرہ عالم ودانشوروں نے اردو زبان وادب کی مختلف صنفوں کو وہ بلندی عطا کی کہ آج بھی دنیا رشک کرتی ہے۔ فن تنقید اور اصول تنقید کو کلیم الدین نے وہ بلندی عطا کی جہاں سے آگے آج تک کوئی نہ جا سکا قاضی عبدالودود نے تحقیق کو ایک فن کی حیثیت سے روشناش کرا کر تحقیق کے میدان میں مرد آہن کا لقب پایا اکیسویں صدی میں تو بے شمار ادیب وشاعر نقاد، محقق، افسانہ نگار، ناول نگار، صحافی وغیرہ دانشوروں کی ایک لمبی فہرست ہے۔

غرض کہ بہار میں اردو زبان و ادب کے تجزیے میں ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان کے چند ادبی مراکز کے ساتھ بہار کا ادبی مرکز مسلم ہے اردو زبان و ادب کے فروغ میں نہایت ہی فعال اور روشن مستقبل کی ضامن ہے۔

وہیں تک خدی ہے وہیں سے خدا ہے　　جہاں سے بے بسی ڈھونڈتی ہو سہارا
جمیل

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
عبیر ہے جس کی حسرت و غم اے نفسو وہ خواب ہیں ہم
یہ بزم مئے ہے یاں کو تاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھالے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے
تمناؤں میں الجھایا گیا ہوں　　کھلونے دے کے بہلا گیا ہوں
شاد

☆☆☆

بہار میں اردو سوانح نگاری

مختلف اصناف ادب کی طرح سوانح نگاری بھی ایک باضابطہ مکمل اور مقبول صنف سخن ہے۔ دیگر اصناف ادب کی طرح یہ بھی عربی سے فارسی اور فارسی سے اردو میں منتقل ہوئی ہے اردو ادب میں اس کے ابتدائی نقوش مختصراً تذکروں میں بھی ملتے ہیں اس میں شعراء و ادباء کے حالات زندگی جائے پیدائش وفات وغیرہ کا ذکر ہوا کرتا تھا یہی عنصر بعد میں ادبی شکل اختیار کر ایک مکمل صنف کی حیثیت سے عالم وجود میں آئی اس صف میں زندگی کے سارے حالات کا مفصل ذکر ہوتا ہے۔

سوانح حیات صنفی اعتبار سے دو طرح کے ہوتے ہیں ایک کو خود نوشت Autobiogrphy اور دوسری کو سوانح حیات کہتے ہیں خودنوشت خود لکھتے ہیں جو زندگی کی کسی بھی موڑ پر آپ بیتی یادداشتوں کے سہارے۔ لکھتے ہیں ایسا کرنے میں خودنوشت لکھنے والوں میں سے کہیں نہ کہیں بھول ہونے کا خطرہ لاحق ہوتا ہے۔ وہ لوگ خودنوشت لکھنے میں زیادہ کامیاب اور Othentic ہوتے ہیں جو ڈائری یا روزنامچے لکھتے ہیں اور خودنوشت لکھتے وقت کسی الجھن یا مسئلہ پر اختلاف ہو جاتا ہے تو وہ روزنامچے کا سہارا لے کر واقعات کی تصدیق کر لیتے ہیں۔ خودنوشت سوانح حیات واحد ذریعہ ہے اس شخص کی ذاتی زندگی پر انحصار کرنے والے حالات و واقعات کی حقیقی اور سچی تصویر پیش کرنے کی اس صنف میں بھی اگر لوگ مبالغہ آرائی سے کام لیں یا کسی اہم سچائی کو چھپا جائیں تو اصلیت و حقیقت اور سچائی کا عیاں ہونا ناممکن ہے اور متذکرہ شخص کی ایک اہم صداقت سے قاری محروم ہو جائے گی اور صنفی اعتبار سے خودنوشت سوانح حیات کے تقاضوں کا حق ادا نہیں ہو پائے گا۔ اس لئے ایک سچے اور دانا خودنوشت نگار کا یہ فرض ہے کہ وہ فنی تقاضوں کو پورا کر کے اور ہر اس واقعات کا ذکر کرے جو اس کی زندگی میں رونما ہوئے ہیں خودنوشت سوانح حیات میں آپ بیتی کا من و عن ربط، تسلسل اور دلچسپی قائم رکھتے ہوئے بیان کرنا ہوتی ہے۔ جیسا کہ Oxfored Dictionary میں Autobiography کے ضمن میں لکھا ہے "The story of one's life, writen by himself"

آپ بیتی میں سچائی فن میں تسلسل و دلچسپی، شخصیت میں چیناپن، زندگی کے کسی بھی شعبے میں عمدہ اور نمایاں کارگذاریاں ہوں مثلاً وہ کسی سیاسی، سماجی، مذہبی یا انفرادی تاریخ ساز کرامت و اقدام سرزد ہوئے ہوں کا ذکر کیا جائے۔ اس طرح خودنوشت سوانح حیات میں ایک شخص نہ صرف اپنے متعلق خود لکھتا ہے بلکہ اپنے

زاویہ نگاہ سے لکھتا ہے اس کی کوشش اس بات کی ہوتی ہے کہ وہ دنیا کے سامنے کیا پیش کرنا چاہتا ہے۔

خودنوشت سوانح عمری اور سوانح حیات دونوں ہی سے ہمیں کسی شخص کی زندگی کے متعلق معلومات حاصل ہوتے ہیں لیکن دونوں کے درمیان ایک بنیادی فرق ہے۔ سوانح نگار کے سامنے دوسری چیز ہوتی ہے یعنی کسی شخص کو لوگ کیا سمجھتے ہیں یا انہیں کیا سمجھنا چاہئے وہ اس بات کو اپنے نقطۂ نظر سے دنیا کے سامنے رکھتا ہے Chamber's encyclopeadia میں سوانح حیات کی تعریف اسطرح کی گئی ہے کہ۔ ''سوانح حیات کسی مخصوص فرد کی زندگی اور کردار کے مسلسل بیان کا فنی کارنامہ اظہار ہوتا ہے۔ اس میں یہ اضافہ کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے سوانح عمری سے زیادہ دلچسپ شعبہ ادب میں نہیں ہوتا ہے نیز یہ کہ نوع انسانی کا دلکش ترین مرکز مطالعہ ہمیشہ سے انسان رہا ہے اور آئندہ بھی رہے گا۔ یہ بات اسی نوعیت کی سوانح عمری یا خودنوشت کے مقابلہ میں نظم یا کبھی کبھار کے مضمون میں کم ہی ہوتی ہے۔''

ماہرین ادب و مفکرین نے سوانح عمری پر اتنا ہی اکتفا کیا بلکہ اپنی فکر کو اور بلیغ کرتے ہوئے cassel's encyclopeadia of literature میں سوانح حیات پر اس طرح رقم طراز ہیں۔

''سوانح عمری تاریخ کی ایک شاخ ہوتی ہے۔ سوانح نگار کا فرض یہ ہے کہ وہ مورخ اور مصوری دونوں حیثیتوں سے کام کرے مصور کا فرض کیا ہوتا ہے؟ تصویر سازی کے لئے بیٹھنے والے کی ایسی شبیہ تیار کرنا جو نہ صرف اس سے ملتی جلتی ہو بلکہ فن کا نمونہ بھی ہو۔ اور مورخ کا فرض کیا ہے ٹھیک ٹھیک باتیں بیان کرنا اور حقائق کو قابل فہم انداز سے ترتیب دینا۔ حقائق کی محض فہرست مرتب کر دینا جس میں فن کاری نہ ہو۔ تاریخ ہے نہ ہی سوانح عمری۔''

اردو ادب میں سوانح حیات کی تاریخ کا مشاہدہ کرتا ہوں تو دیکھتے ہیں کہ اس پر مذہبی رنگ غالب ہے ہونا بھی چاہئے تھا کیوں کہ اردو داں طبقہ کے سامنے بانی اسلام، حضرت محمدؐ خلفائے راشدین، شہدائے کربلا اور بزرگان دین سے بڑھکر کوئی دوسرا ایسا کردار نہیں تھا جس کی زندگی کا ذکر و شوق کے ساتھ کیا جاسکتا تھا یہی وجہ ہے کہ اردو ادب کے سوانحی تاریخ میں متذکرہ لوگوں کے حالات زندگی کا ذکر کیا گیا تا کہ قاری اس سے سبق حاصل کریں اور، اپنی زندگی میں اصلاح کر سکے شروعاتی عہد میں یہ صنف صوفیوں اور مبلغوں کے ہاتھ انجام پاتے رہے افضل کی بارہ ماسہ اور فضلی کی کربل کتھا۔ سب مذہبی محرکات کے زیر اثر لکھی گئی ہیں سوانح عمری کے ابتدائی دور میں تذکروں نے بھی بہت اہم کردار ادا کیا ہے ان سب میں سب سے زیادہ مشہور تذکرہ ''آب حیات'' ایک ایسا تذکرہ ہے جس میں سوانح نگاری کے اجزاء پائے جاتے ہیں یہ تذکرہ اور سوانح حیات کے درمیان کی ایک کڑی ہے۔ کیوں کہ اس میں زندگی کی حرارت، ادات و اطوار، لطیفوں اور

بزلہ سنجیوں کے ذریعہ کردار کی شناخت، موت و حیات کی سطیں کا تعین اور ان کی خوبیوں وخامیوں پر سیر حاصل تبصرہ ملتا ہے۔ان تمام تفصیلات اور واقعات کے اظہار میں بعض لوگوں کو چونکانے اور کچھ کو پیش پشت رکھنے کا جذبہ بھی ہے محمد حسین آزاد نے اپنی ذاتی تاثرات کا برملا اظہار کیا ہے ابتدائی نقوش کی فہرست میں سب سے نمایاں غالب کے خطوط ہیں جس نے سوانح حیات کا ایک الگ اور انوکھا انداز پیش کر کے لوگوں کو متحیر کر دیا۔

پہلی ناکام جنگ آزادی کے بعد لوگوں کے فکر میں تغیر آیا اور ادیب، شاعر اپنے اصلاف کے کار ناموں کو سوانح حیات کے ذریعہ ایک مثالی کردار بنا کر پیش کرنے لگے ان میں سر سید احمد خاں کی کتاب سیرت فرزندیہ، آثار الصنادید خطبات احمدیہ کا شمار سوانح عمری میں کر سکتے ہیں حالانکہ معیاری سوانح نگاری کی ابتدا حالی سے ہوتی ہے انہوں نے عربی، فارسی اور انگریزی سوانح عمریوں کا مطالعہ کیا اور اس کے تناظر میں اردو میں معیاری سوانح عمری کی بنیاد رکھی اردو میں سوانح نگاری کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے ہمیں باقر آگاہ کی کتاب ''ریاض اکسر'' متوفی ۱۲۲۳ھ کو تسلیم کرتے ہیں تو اسی زمانے میں بہار میں بھی سوانح عمری لکھی گئی۔فیض عام کبیر اور حدیقہ شہباز یہ''۔فیض عام کبیر کے مصنف ظہور الحق ظہور نے ۱۲۲۸ء میں اور حدیقہ شہباز یہ مصنف محمد شاہ صاحب شہرت نے اسی سال زیور طبع سے آراستہ کر منظر عام پر لایا۔اس طرح سوانح نگاری کی تاریخ میں باقر آگاہ کے فوراً بعد ظہور اور شہرت کا نام آتا ہے۔ان دونوں کے سوانح حیات میں صاحب سوانح کے حالات زندگی کا ذکر مفصل طور پر کیا گیا ہے اسے بہار میں سوانح نگاری کی تاریخ میں ایک مقام حاصل ہے۔

فیض عام کبیر اور حدیقہ شہباز یہ کے بعد بہار میں اردو سوانح نگاری لکھنے کا دور شروع ہو جاتا ہے جو آج بھی جاری ہے۔ پروفیسر عبدالغفور شہباز نے روایتی سوانح نگاری سے انحراف کرتے ہوئے نظیر اکبرآبادی کی سوانح'' زندگانی بے نظیر'' منظر عام پر آئی یہ اس معنی میں منفرد ہے کہ اس کا موضوع ایک عام آدمی ہے۔اس کی اہمیت صرف اس لئے نہیں ہے کہ یہ نظیر کی زندگی پر اردو کی پہلی سوانح عمری ہے بلکہ اس لئے ہے کہ اس نے بہار میں دوسرے سوانح نگاروں کو عام آدمیوں کی زندگیوں کی طرف مائل کیا اور لوگوں نے اس طریقہ کار کو خوب خوب سراہا۔

بیسوں صدی کا زمانہ بہار کے ادیبوں خصوصاً سوانح نگاری کے میدان میں عہد زرّیں کا مرتبہ رکھتا ہے اس زمانہ میں سوانح نگاری سے رغبت رکھنے والوں میں اردو کے مشہور معروف ادیب، انشاء پرداز اور شاعر شامل ہیں۔ان میں اولاد حیدر فوق بلگرامی، سید سلیمان ندوی، مناظر احسن گیلانی اور شاد عظیم آبادی

وغیرہ لوگوں نے اردو میں سوانح نگاری کی روایت کو آگے بڑھانے میں کار ہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔

سید ظہور الحق ظہوؔر کی تصنیف کردہ کتاب ''فیض عام کبیر'' بہار میں سوانح نگاری کی تاریخ میں اولیت کا درجہ و مرتبہ رکھتی ہے یہ کتاب حضور اکرمؐ کی سیرت پر مبنی ہے اس میں آپ کی پیدائش اسم مبارک، طفولیت، شکل، شمائل، خدیجہ اکبریٰ سے نکاح، نزول وحی، نبوت، تبلیغ و اشاعت اسلام، ہجرت، غزوات، اسوۂ حسینہ اسلامی فتوحات وغیرہ کا ذکر ہے۔

مولوی شاہ صاحب شہرؔت سر شتہ دار منصفی بھاگلپور کی تصنیف کردہ کتاب ''حدیقۂ شہبازیہ'' میں حضرت مولانا شہبازؒ کے حالات زندگی، صبر و قناعت، کشف و کرامات اور خاندانی شجرہ شامل ہے۔ یہ کتاب اردو سوانح نگاری کی تاریخ میں بحیثیت اوّلین نقوش کی ہے۔

نواب علی خاں کی کتاب ''ہادی اور ایمان'' اور ''صادق الاذکار'' لکھی۔ ہادی الا یمان میں امام باقرؒ کے احوال ''قلم بند کئے گئے ہیں اس میں نام منسب لقب، کنیت آل اولاد، مقام پیدائش، قد و قامت، انگشتری اور شہادت کے احوال رقم ہوئے ہیں۔ پوری کتاب میں مقفّی نثر کا التزام ہے۔ ان کی دوسری کتاب'' صادق الاذکار'' میں حضرت امام جعفرؒ کے احوال بیان کئے گئے ہیں۔ فنّی اعتبار سے ہادی الایمان ہی کی طرح ہے مزکورہ دونوں ہی کتاب بہار میں سوانح نگاری کی تاریخ میں ایک اہم مقام رکھتی ہے۔

سید شاہ محمد عبدالوحید کی تصنیف کردہ سوانح عمری'' حقائق آگاہ عارف باللہ'' ہے اس میں حضرت فضل اللہ قادری کے حالات زندگی رقم ہوئے ہیں۔

سید شاہ عطا حسین فانؔی بانی خانقاہ ابوالعالائیہ منعمی نے چار سوانح عمریاں لکھی ہیں ان میں ''تذکرہ صدیقہ''، ''تذکرہ عمریہ''، ''تذکرہ عثمانیہ'' اور مولود مرتضویہ'' ہے اس کے علاوہ حضرت سیدہ نساء العالمین اور تذکرہ خواجہ معین الدین چشتیؒ'' شامل ہے۔ تذکرہ صدیقہ میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کی حالات زندگی پر مشتمل ہے تذکرہ عثمانیہ میں حضرت عثمان غنیؓ کی حالات زندگی پر مشتمل ہے تذکرہ عمریہ میں حضرت عمر فاروقؓ کی حالات زندگی پر مشتمل ہے اور مولود مرتضویہ میں حضرت علی مرتضیٰ کا حسب و نسب و حالات زندگی بیان کئے گئے ہیں۔

عبدالرحیم داناپوری کی تصنیف کردہ کتاب '' افضل السیر '' میں حضور اکرمؐ، حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان غنیؓ، حضرت علی مرتضیٰ، حضرت سیدہ زہرہ فاطمہؓ، امام حسنؓ اور امام حسینؓ کی حالات زندگی بہت ہی والہانہ انداز میں پیش کئے گئے ہیں۔

سید محمد فضیلت حسین کی کتاب ''سیرت النبی'' بہار میں سوانح نگاری کی فہرست میں ایک اہم

اضافہ ہے۔ اس کتاب میں حضور کی حالات زندگی اور سیرت بیان کیے گئے ہیں۔ بہار میں سوانح نگاری کی تاریخ میں سیرت الصدّیقی مصنف عبدالرحیم، سیرت نبی مصنف حسین میاں صاحب، وسیلۂ شرف و زریعہ دولت، مصنف سید شاہ فرزند علی، کمالات رحمانی مصنف مولانا شاہ تجمل حسین، السیّد ہ مصنف حسین میاں، سیرت الشرف مصنف سید ضمیر الدین، حضرت شاہ سلمان نے نصر مولوی ابوالحسنات نے الروض المطور، فضل حسن نے الحیات بعد المحات، حافظ وزیرالدین احمد ظہوری شیخپورہ نے مخدوم شعیبؒ کی سوانح ''سیرت الشعیب لکھی متذکرہ سبھی کتابیں بہار میں لکھی جانے والی سوانح عمریوں میں اہمیت کا حامل ہے سب سے زیادہ فوق بلگرامی نے قابل قدر چودہ سوانح عمری تصنیف کی مذکورہ سبھی سوانح نگاروں نے بانی اسلام خلفہ ءراشدین اور بزرگان دین سے بے پناہ محبت وعقیدت پرمبنی مذہبیت کا رنگ غالب ہے جوفنی اعتبار سے سوانح نگاری کی تکنیک کو پورا نہیں کر سکے ذوق سلیم اور عقیدت مندی میں اپنے بزرگوں کے حالات زندگی بیان کر گئے ہیں جہاں تک فن سوانح نگاری کا سوال ہے تو مذہبی رجحان سے الگ ہو کر انفرادی شخصیت پر سوانح نگاری کی عام روایت سے ہٹ کر سرسید، حالؔی اور شبؔلی سے متاثر ہو کر پروفیسر عبدالغفور شہباز نے ''زندگانی بے نظر'' لکھ کر بہار کے سوانح نگاروں کو ایک نیا موڑ عطا کیا۔

''زندگانی بے نظیر'' میں عبدالغفور شہباز نے نظیر اکبر آبادی کی حالات زندگی کو بہت ہی خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے اور بے نظیر کا ذکر تذکروں میں خال خال ہی رہا کرتا تھا۔

سید سلیمان ندوی نے اپنے استاد کی ''سیرت النبیؐ'' ادھوری کو مکمل کیا بلکہ اسی انداز اور اسی پیرائے میں۔ ان کی دوسری اہم سوانح عمریوں میں ''حیات شبلی'' ''خیام'' سیرت عائشہ، حیات مالک، رحمت عالم وغیرہ سوانح عمریاں فنی تقاضوں سے پوری واقفیت ہی نہیں بلک جاذبیت اور وحدت تاثر قائم رکھنے کے ماہر بھی ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے شاہ تجمل حسین دسنوی کی حالات پرمبنی کتاب ''تذکرہ شاہ تجمل حسین''، لکھی۔

شیخ بہادر علی خاں عاشق نے حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کی سوانح عمری ''فیضان سبحان'' کے نام سے تحریر کی اور شاہ محمد ہاشم حسین آبادی (شیخپورہ) نے خودنوشت سوانح عمری ''سکرات'' کے نام سے تحریر کی شادؔ عظیم آبادی کی تصنیف کردہ خودنوشت ''شاد کی کہانی شاد کی زبانی'' اور سوانح عمرہ ''حیات فریاد'' لکھی اول الذکر کتاب ادبی حلقوں میں کافی چرچہ میں رہی اور قاضی عبدالودود نے اس کی درونِ تحریر کی صداقت کو تسلیم نہیں کیا اور اس کے اعتراض میں کئی صفحے رنگ ڈالے غرضکہ فنی حیثیت سے ''شاد کی کہانی شاد کی زبانی'' خودنشت کے ضابطے کو پورا نہیں کرتی البتہ حیات فریاد میں سوانح عمری کی اچھی مثال ملتی ہے،

محمد عبدالغنی شیخپوری نے ''تذکرہ رسولؐ سید معین الدین قیس نے ''گلشن حیات، کے نام سے شاد عظیم آبادی کے حالات زندگی کا مفصل بیان کیا ہے سید محمد عبدالاحد قاسمی مونگیری نے ''حیات اعزا، میں مولانا محمد اعزاز علیؒ کی حیات زندگانی ہے ضمیر الدین گیاوی نے اردو کے مشہور شاعر مومن کی سوانح عمری ''حیات مومن'' کے نام سے لکھی۔ سردار محمد میر خاں نے ''چمنستان سعادت، لکھی۔

سید مناظر احسن گیلانی نے ''النبی الخاتم'' تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ'' امام ابوحنیفہؒ کی سیاسی زندگی اور'' سوانح قاسمی'' تین جلدوں میں'' سوانح ابوذر غفاری اور سوانح عمری حضرت اویس قرنیؓ لکھی اور خودنوشت میں ''سید بدرالحسن'' لکھ کر سوانح نگاری اور خودنوشت نگاری کے معیار کو بلند کیا ہے۔

''حیات احمد بن حنبل'' مصنف شاہ عزالدین پھلواروی ''حیات رضاؒ'' خودنوشت قاضی رضا حسین ''اشوۂ شیداء کربلا مصنف صدیقی علی جمشید پوری، خاتم سلیمانی مصنف غلام حسین ندوی'' حیات شیر شاہ مصنف اختر سہرامی' تذکرہ فانی مصنف سید شاہ حسین منعمی، اسوۂ حسنہ رسول کریم' مصنف بھونیشری سہائے نورالہدیٰ' مصنف سید ابومحفوظ ذکر اشرف' مصنف شاہ محمد سلیمان چشتی پھلواروی' محمد بن عبدالوہاب مصنف مسعود عالم ندوی' حسرت کی سیاسی زندگی مصنف عبدالقوی دسنوی' یادگار شاد مصنف نقی احمد شاد وغیرہ لوگوں نے سوانح حیات لکھ کر بہار میں سوانح نگاری کی ایک لمبی فہرست قائم کر لی ہے۔

اس طرح بہار میں سوانح نگاری کی ابتداء اسی عہد میں ہوئی ہے جب اردو کا پہلا سوانح باقر اگاہ کی ریاض السیر'' اور بہار کی'' فیض عام کبیر لکھی گئی اس طرح اردو کی سوانح تاریخ میں بہار کے سوانح نگار کی اہمیت مسلّم ہے اور سوانح نگاری کے فروغ میں قدم بہ قدم رہے ہیں۔

☆☆☆

بھار میں اردو تنقید نگاری

تنقید عربی زبان کا لفظ ہے اس کے لغوی معنی جانچ' پرکھ' نکتہ چینی اور ایسی جانچ جس سے اچھے برے کی تمیز ہو جائے تنقید ہے۔ تنقید صرف نکتہ چینی یا عیب جوئی کا کام نہیں ہے بلکہ تنقید کسی بھی ادبی تخلیق کے معائب ومحاسن کا مطالعہ کر کے اس کی صحیح قدروں کو متعین کرتی ہے۔ تنقید کا کام قاری کے سامنے ادب کی ترجمانی کرنا ہے اور اس کے محاسن واقدار کو سمجھنے میں مدد کرنا ہے۔ ابتداء میں نقاد تخالیق میں صنف گری تصنع اور اس کی ہیئت پر زور دیتے تھے شروعاتی عہد میں تنقید کسی ادبی تخلیق کی خوبیوں کو ظاہر کرنے کا ذریعہ تھا دوسرا تشریح کا جس میں کسی بھی ادیب یا فنکار کی تخلیق کو تفصیل اور صراحت کے ساتھ پیش کر دیا جائے تیسرا تجزیئے کا ہے اس میں ناقد یہ دیکھتا ہے کہ کن خیالات کے تحت فنکار نے اپنے فن کی تخلیق کی ہے یعنی مفہوم کو اچھی طرح سمجھنا اور سمجھانا تنقید نگاری کا اصل مقصد ہے

تنقید اپنی ارتقائی منزلیں طے کرتی ہوئی ایک مکمل فن کی صورت اختیار کی تو نقادوں کے مختلف فکر اور نظریات سامنے آئے ان میں رومانی ونفسیاتی تنقید' جمالیاتی وتاثراتی تنقید' تاریخی' مارکسی وسائنٹفک تنقید' تعریفی تنقید' توصیفی یا تشریحی تنقید' تقابلی تنقید' تجزیاتی تنقید وغیرہ مکتبہ فکر کے ناقدوں نے تخلیقی ادب ہر اپنے نظریوں سے محاسبہ کر قاری کے مطالعہ کے لئے پیش کرتا ہے۔ یوں تو تنقید کا مادّہ ہر فرد کے شعور میں شامل ہوتا ہے جہاں وہ اپنی پسند اور ناپسند کا اظہار کرتا ہے وہیں سے تنقیدی بصیرت کا صوت پھوٹتا ہے ایک عام انسان سرسری طور پر اپنے خیال کا اظہار کرتا ہوا نکل جاتا ہے لیکن ایک اہل قلم اس کی داخلی اور خارجی خوبیوں وخامیوں پر منطقی وفلسفیانہ بحث کرتے ہوئے اس کا معیار متعین کرتا ہے۔

اردو ادب میں تنقید کا مادّہ ابتدا سے ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ یہ علم استادوں کے ذریعہ شاگردوں کے تخالیق کی اصلاح پر منحصر ہوا کرتا تھا جو سینہ بہ سینہ دوسروں تک پہنچ رہا تھا۔ تنقید کا ابتدائی عکس تذکروں میں دیکھنے کو ملتا ہے جہاں تذکرہ نگار شاعروں کے کلام پر اپنا خیال ظاہر کرتے تھے جس میں متذکرہ شاعر کا کلام کا تجزیہ کیا کرتے تھے یہی فن آگے چل کر ایک صنف کی صورت اختیار کر لیا جیسے ہم تنقید کے نام سے جانتے ہیں اب اس کے اصول وضوابط مرتب کے گئے اور حالات کے تحت نکتہ فکر وجود میں آتے گئے۔ اس تنقیدی سفر میں مختلف نظریوں ادیب وشاعر کو بھی خانوں میں تقسیم کر کے ان کے تخالیق پر مدلل بحث کر ایک جامع نظریہ پیش کرنے لگے۔

اردو ادب کے اس تنقیدی سفر میں بہار کے ناقدوں نے بھی اپنی صلاحتوں کا مظاہرہ کیا ہے۔
اردو ادب کے ابتدائی عہد کا مطالعہ کرتے ہیں تو شروعات میں تذکرہ نگاری کا دور رہا ہے اس دور میں بھی بہار کے ادیبوں نے تذکرہ نگاری میں اپنی حاکمیت برقرار رکھتے ہوئے پورے اردو ادب کے لئے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں تذکرہ نگاروں میں ''تذکرہ شورش'' مصنف میر غلام حسین شورش متوفی 1195 صف اوّل کے تذکرہ نگاروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ یہ محض ایک تذکرہ نگار ہی نہیں بلکہ ایک بلند پایہ شاعر بھی تھے شعراء ریختہ کے بارے میں ان کا یہ تذکرہ بہار کا پہلا تذکرہ ہے مذکورہ تذکرہ میں شورش نے صرف بہار کی شاعروں کا ذکر نہیں کیا ہے بلکہ اس دور کے تمام شاعروں کا ذکر ہے جو قابل محترم تھے اس تذکرہ کے مطالعہ سے ان کے تنقیدی بصیرت کے ابتدائی نمونے ملتے ہیں جس میں انہوں نے اپنے آرا سے شاعروں کے کلام پر اچھے اور برے ہونے کا مہر سبطہ کیا ہے۔

''تذکرہ گلزار، ابراہیم'' مصنف نواب علی ابراہیم خاں خلیل حسینہ آبادی شیخپورہ اردو و فارسی دونوں ہی زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ ان کے کلام کے نمونے تذکرہ شورش اور تذکرہ عشقی میں درج ہیں تذکرہ گلزار ابراہیم متوفی ۱۱۹۸ھ فارسی زبان میں ریختہ گو شاعروں کا ذکر ہے یہ تمام شعراء بہ اعتبار حروف تہجی رقم کئے گئے ہیں۔ اس میں ہر طبقہ کے شاعر شامل کئے گئے ہیں سلاطین نامدار وزرائے والا تبار علمائے عالی مقدار اور شعراء صاحب وقار کے ساتھ نومشق اور نیم معروف شعرا کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اس کا اردو ترجمہ ۱۲۱۵ھ میں مرزا علی لطف نے ''گلشن ہند'' کے نام سے کیا ہے۔ جہاں تک گلشن ہند کا سوال ہے احسن مارہروی نے اسے اردو کا سب سے پہلا تذکرہ قرار دیتے ہیں۔ گلزار ابراہیم یا گلشن ہند میں شاعروں کے کلام پر اس کے حسن بیان اور معیار کا تعین تنقید کے ابتدائی رجحان کا پتا چلتا ہے۔

''تذکرہ عشقی'' مصنف شیخ محمد وجیہ الدین عشقی اردو شاعروں کا ذکر فارسی زبان میں ہے اور جلوۂ خضر مصنف صغیر بلگرامی نے پہلی بار تذکرہ نگاری کا ایک نیا انداز پیش کیا جس میں شاعروں کے معیار کا تعین صاحب حیثیت سے نہ کر اس کے فن اور اجزائے ترکیبی پر ضمنن ذکر کرتے ہوئے اس کے اقدار کو سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے جو روایتی انداز تذکرہ نگاری سے ذراہٹ کر ہے۔

نوائے وطن شاد عظیم آبادی نے دو حصوں میں فکر بلیغ کے نام سے تذکرہ لکھا اس میں مرثیہ گو شاعروں کا تذکرہ اور ان کے اشعار پر تنقیدی نگاہ ڈالنے کے بعد ان کی تصیح بھی کی گئی ہے یہ ایک جرت مندانہ قدم تھا جو اب تک استاد شعراء اپنے شاگردوں کے کلام کی اصلاح کیا کرتے تھے اسے شاد نے تذکرہ میں اصلی شعر اور اصلاح شدہ شعر درج تنقید نگاری کی راہ کو ہموار کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ حیات

فریاد مکتوبات شاد نقش پائدار وغیرہ لکھی ہیں جن میں شعراء کے حالات اور اشعار پر تبصرہ کئے گئے ہیں تذکرہ ہندو شعرائے بہار مولف فصیح الدین بلخی اور تذکرہ مسلم شعرائے بہار مولف حکیم سید احمد اللہ ندوی نے بہار میں تنقید نگاری کی راہ ہموار کرنے میں کلیدی کردار نبھائے ہیں۔ بہار میں تذکرہ نگاری سے تنقید نگاری کی طرف رخ کرنے کے سفر میں جنہوں نے مکمل طور پر تنقید کے میدان میں اپنا ایک اہم مقام متعین کیا ان میں اہم نام پروفیسر عبدالمنظور شہباز ہے۔

سید المنظور شہباز کا سب سے اہم تنقیدی کارنامہ ''زندگانی بے نظیر'' ہے بلا شبہہ یہ ایک اچھا تنقیدی کارنامہ ہے اس میں کلام نظیر کی مختلف خصوصیات کو مثالوں کی روشنی میں واضح کیا گیا ہے اس کے علاوہ بعض دوسرے شعراء سے نظیر کا مقابلہ وموازنہ بھی کیا گیا ہے اور ضمنی طور پر ان شاعروں کے بارے میں کچھ رائیں بھی دی گئی ہیں۔ نصیر حسین خیال کا ذکر بہار کے ابتدائی تنقید نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کی مشہور کتاب ''داستان اردو'' شاہنامہ فردوسی پر ایک طویل تنقیدی مضمون مرثیہ گویوں کا تذکرہ اور گارساں دتاسی کے تذکرہ شعراء اردو ان کی ادبی علمی اور تنقیدی مضامین ہیں۔ ''داستان اردو'' میں مغل اور اردو کے عنوان سے اردو زبان کی تاریخ کے مختلف گوشے منور کئے گئے ہیں۔ ان کے اس کوشش کو لوگ خالص تنقید نہیں مانتے مگر پھر بھی یہ تذکرہ اور تنقید کے درمیان کی چیز ہے۔ خیال کا یہ کارنامہ گرچہ کسی مکتبہ فکر کی نمائندگی نہیں کرتی ان کا انداز بیان پر کشش اور جاذب ہے تنقید کی وہ خوبی موجود ہے جو ایک مدبر اور مفکر نقاد کے یہاں ہوتا ہے۔

مولانا سید سلیمان ندوی کی شہرت ماہر اسلامیات اور مورخ اسلام کی ہے مزید برآں کہ ان میں تنقیدی شعور اور بصیرت کا پتا چلتا ہے ان کے خطبات مقدمات اور مقالات کے مجموعے ''نقوش سلیمان'' مشہور فارسی شاعر خیام پر لکھی گئی کتاب ''خیام'' کے مطالعے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک بالیدہ تنقیدی شعور رکھتے تھے اور کسی بھی موضوع پر تنقیدی نقطہ نظر سے بحث کرتے وقت اس کے تاریخی پس منظر کو بھی سامنے رکھتے تھے۔ اسلوب بیان کے لحاظ سے وہ اپنے استاد شبلی سے متاثر تھے ان کی تنقید نگاری کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ کسی بھی موضوع پر بے حد اختصار کے ساتھ انتہائی جامع و مانع انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں اور اسی اختصار میں موضوع پر دوسری کتابیں تخلیق کرنے میں جس انہماک سنجیدگی اور توازن کے ساتھ کام کیا ہے وہ ان کی تنقیدی آراء میں بھی نظر آتا ہے تلاش تفتیش کی رہنمائی میں ان کے تنقیدی مضامین کافی پر مغز اور کارآمد ہیں سید سلیمان ندوی نے اردو زبان کی پیدائش کے سلسلے میں اپنا ایک علیحدہ اور منفرد نظریہ پیش کیا ہے جس کے مطابق اردو زبان سندھ میں پیدا ہوئی ہے۔ مذکورہ

کتاب جس عرق ریزی اور تحقیقی وتنقیدی جسارت سے لکھی گئی ہے وہ اپنے آپ میں ایک مثال ہے۔

مناظر احسن گیلانی کی شہرت اصل میں اسلامیات اور سوانح عمری میں ہے لیکن ان کے اندر بھی تنقیدی مادہ موجود تھا جس کا مظاہرہ شاد عظیم آبادی کی اردو رباعیات ''گنجینہء عرفان'' کے نام سے منظر عام پر آئی شاد کی رباعیوں کا جائزہ لیتے وقت وہ عملی تنقید کی سرحدوں میں داخل ہو جاتے ہیں اور رباعیات شاد کے بعض اہم نکات پر بھرپور روشنی ڈالتے ہوئے اپنی تنقیدی صلاحیت کا شعور پیش کرتے ہیں۔

معین الدین دردائی بہار کے ان چند ابتدائی ناقدوں میں ہیں جنکے کارناموں سے اردو ادب مال ومال ہوئی ہے ان کی شہرہ آفاق کتاب ''بہار اور اردو شاعری'' ایک تذکرہ ہوتے ہوئے بھی تنقید نگاری کی اعلیٰ وعمدہ جھلک عیاں ہو جاتی ہے۔ اس میں شعرائے بہار پر سیر حاصل بحث کرتے ہیں ان کے حالات زندگی مع نمونہ کلام اور بعض شعراء کے کلام پر ان کی انفرادیت پر خصوصی توجہ دیتے ہوئے اس کی خوبیوں اور خامیوں پر ناقدانہ نگاہ سے تبصرہ کیا ہے اور اپنی رائے ظاہر کی ہے۔

جمیل مظہری کو اردو دنیا ایک بلند پایہ شاعر کی حیثیت سے جانتی ہے لیکن انہوں نے تقریباً ۳۶ ایسے ادبی مضامین تحریر کئے ہیں جس میں عمدہ تنقیدی سوجھ بوجھ اور اسلوب بیان کے ذریعہ صاحب مضمون کے کلام کی خوبی وخامی پر دوٹوک رائے پیش کر کے عمدہ تنقیدی صلاحیت کا مظاہرہ کرتے ہیں ان کے موضوعات میں تنوع ہے اور زیر بحث موضوعات پر مکمل وبسیط تنقید کرتے ہیں نواب امداد امام آثر کی شہرت ''کاشف الحقائق'' کی وجہ کر ہے اس کے علاوہ کئی نثری کاوشیں ہیں لیکن جس کتاب نے انہیں شہرت عام اور بقائے دوام بخشی وہ ''کاشف الحقائق'' ہے نواب امداد امام آثر نہ صرف ایک اچھے شاعر تھے بلکہ شاعری کے مختلف تقاضوں اور زبانوں کے اعلیٰ شعری نمونوں سے بھی بہ خوبی واقفیت رکھتے تھے اور اپنی وسعت نظری اور تفصیل پیش کیا کرتے اور وہ اپنی بے لاگ رائے کے اظہار میں مصلحت کوشی کو راہ دیتے تھے۔ شاعروں کی انفرادی خصوصیت کا بیان ہو یا کسی صنف شاعری کے حسن وقبح کا تذکرہ وہ نہایت بے باکی بے خوفی اور وضاحت کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کر دیتے تھے۔

پروفیسر کلیم الدین احمد اردو تنقید کا ایک قدآور شخصیت ہیں جس کے وجود سے انتقاد عالم اردو سہم جاتے اور بڑے بڑے نام چیں شخصیتوں نے ان کے سامنے زانوے تلمذ تہہ کیا۔ اور ادیبوں اور شاعروں نے اپنے فن پاروں میں بہت ہی محتاط رویہ اختیار کرنے لگے جس سے اردو ادب کو ایک نئی روح اور توانائی ملی جب انہوں نے لکھا اردو میں تنقید کا وجود محض فرضی ہے۔ یا اقلیدس کا خیالی نقطہ'' تو ہر طرف سے ایک شور بے سُرا بلند ہونے لگا بہتوں نے ان کے ساتھ ہو کر حمایت میں نعرہ بلند کرنے لگے اور کچھ نے

مخالفانہ رویہ اختیار کیا عرض کہ انتقاد ادب اردو میں ہر طرف سے لوگ مخالفت ومخاصمت میں صف آرا ہو گئے لیکن کلیم الدین احمد اپنی جگہ مجتہد رہے ان کی تنقیدی بصیرت بے ٹوک اظہار خیال جامع اور سہل اسلوب بیان تنقید نگاری کے اجزاء ہیں انہوں نے "اردو شاعری پر ایک نظر"، "اردو تنقید پر ایک نظر" اردو زبان اور فن داستان گوئی، سخن ہائے گفتنی، عملی تنقید، اقبال ایک مطالعہ، میری تنقید ایک باز دید اور ادبی تنقید کے اصول میں تنقیدی نقطہ نظر کی وضاحت ہوئی ہے اور عملی تنقید کے نقوش واضح طور پر ابھر کر ہمارے سامنے آئے ہیں کلیم الدین احمد ترقی پسند تحریک اور اس وقت کے دیگر دوسری تحریکوں کے سائے میں رہنے کے باوجود ادب کے مطالعے میں اس کی سیاسی، سماجی یا عمرانی پس منظر کو پیش نظر نہیں رکھتے بلکہ تنقید کی رہ گذر طے کرتے وقت صرف ادبی وفنی اصولوں کو مشعل راہ بناتے ہیں۔

اختر اورینوی ایک معلم، مقرر، افسانہ نگار، شاعر، صحافی، محقق، ڈرامہ نگار اور نقاد کی حیثیت سے علمی و ادبی دنیا میں نمایاں حیثیت کے حامل ہیں۔ انہوں نے مطالعہ نظیر، مطالعہ اقبال، کسوٹی، تنقید جدید، تحقیق وتنقید، قدر ونظر، سراج ومنہاج اور مطالعہ ومحاسبہ میں ان کی تنقید نگاری کا اعلیٰ نمونہ ملتا ہے ان کے تنقیدی مضامین کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اختر اورینوی نے ادب میں فنی اور افادی دونوں پہلوؤں کو اہمیت دیتے ہیں جمالیات کے مناسبت سے ان کا اپنا ایک الگ تصور ہے جو مشرقی جمالیات کی ساری ادائیں اس میں پوشیدہ ہیں اسی لئے وہ ادب وفن کی بنیادی قدروں میں جمالیات ہی کو قرار دیتے ہیں۔ لیکن جدید علوم و فنون اور مغربی افکار اور نظریات کے دوش بہ دوش اسلامی نظام حیات کے مطالعے نے اختر اورینوی کے ذہن جمالیات کے ساتھ ساتھ مذہبیت واخلاق کا ایک بالیدہ تصور ملتا ہے۔

ڈاکٹر شکیل الرحمن فرائڈ کے نقطہ نظر کی حمایت کرتے ہیں یعنی ادب میں نفسیت کا عنصر ہونا زندگی کی جبلی عادت میں شمار کرتے ہیں انہوں نے "ادب اور نفسیات"، کلیم الدین بحیثیت نقاد، سردار جعفری کا لالا سلام، ترقی پسند ادب اور غزل، ادب کی جدلیاتی ماہیت اردو افسانہ کا مستقبل، جوش کے سماجی شعور کا تجزیہ، اردو ادب میں آزاد نظمیں وغیرہ اہم کتابیں ہیں۔ جس میں فرائڈ اور مارکس کے فلسفے کی بنیاد پر اظہار خیال ہے ان کا نقطہ نظر جو ان کی تنقید میں واضح ہوا ہے وہ نسبتاً زیادہ اعتدال سے تنقیدی نظریئے کو بروئے عمل لایا ہے۔ شکیل الرحمن کی طرح عبدالمغنی نے اپنے مختلف تنقیدوں مضامین کے علاوہ نقطہ نظر" جادۂ اعتدال، تشکیل جدید معیار واقتدار برناڈ شا، اختر اورینوی کے افسانے، سلور کنگ، اقبال اور عالمی ادب وغیرہ میں ان کے تنقیدی بصیرت کی عکاسی اعتدال پسندی سے کیا ہے، ادبی تنقید کے سلسلے میں ان کا ماننا ہے کہ انسان کی زندگی ایک الوہی تخلیق کا نتیجہ ہے اور فن اپنے جمالیاتی وسائل سے ہم آہنگ ہے چونکہ ادب زندگی کا آئینہ ہے اور تنقید نہ صرف ادب کی

کسوٹی ہے بلکہ رہنمائی بھی کرتی ہے اس لئے اخلاق قدروں سے بیگانہ نہیں رہ سکتی اس لئے ادب میں اخلاقی قدروں کی قدر و منزلت اور اہمیت پر قدرے توجہ اور زور دیا ہے۔ انہوں نے ادب کی خارجی ہیئت اور فنی لوازمات سے زیادہ اہمیت وافادیت ادب میں پیش کردہ اخلاقی قدروں کو دی گئی ہے تنقید کی روشنی میں جو کارہائے نمایاں اردو ادب کے لئے دی ہے وہ ایک بلند مرتبت کا حامل ہے اور عبدالمغنی بہار کے ان جاں بازوں میں ہیں جو اپنے لئے ادب کی دنیا میں ایک الگ اور منفرد مقام حاصل کیا ہے۔ کلیم الدین احمد کے بعد بہار کی سرزمین سے بلند ہونے والا یہ شخص ادبی حلقوں میں بڑا محترم ہے

وہاب اشرفی بہار کے ناقدوں میں ایک نام انکا بھی لیا جاتا ہے انہوں نے قطب مشتری اور اسکا تنقیدی جائزہ سے تنقیدی سفر کا آغاز کرتے ہیں اور ''بہار میں افسانہ نگاری' سہیل عظیم آبادی کی افسانہ نگاری اور ان کے افسانے' مثنوی اور مثنویات' کاشف حقائق معہ مقدمہ' تاریخ ادبیات عالم اور مثنویات میر کا تنقیدی جائزہ' معنی کی تلاش' نئی قدریں' قدیم ادبی تنقید وغیرہ کے مطالعے سے یہ پتا چلتا ہے کہ وہاب اشرفی کسی مکتبہ فکر سے متاثر نہیں ہیں اور نہ ہی کوئی اپنا نقطۂ فکر پیش کرتے ہیں۔ ادبی فن پاروں پر تنقید محض ایک تاثراتی تبصرہ ہے جسے خوبصورت اسلوب کا لباس پہنادیا گیا ہے یہ ناقد کم اور مبصر زیادہ ہیں۔

بہار کے دوسرے ناقدین جنہوں نے اردو ادب کے تنقیدی سفر میں کارنامے انجام دیئے ہیں ان میں سید شاہ عطاالرحمن عطا کاکوی' پروفیسر سید حسن' محمد مظفر حسین' پروفیسر سید محمد محسن ذکی الحق' ڈاکٹر ممتاز احمد' ابوزر عثمانی لطف الرحمن' مظہر امام' نجم امام' نجم الہدیٰ قمر اعظم ہاشمی مظفر اقبال' احمد سجاد' جواں سال ڈاکٹر رضی احمد شاداب وغیرہ ناقدوں نے بہار کے اردو تنقید کی دنیا میں اپنے مخصوص نظریات اور اسلوب سے ایک مخصوص مقام حاصل کرلیا ہے اتنا ہی نہیں بلکہ دور حاضر کے جن ناقدوں کا نام بلند ہو رہا ہے ان میں مناظر عاشق ہرگانوی' ڈاکٹر اعجاز علی ارشد نے تنقیدی سفر کو اور بھی تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھانے میں لگے ہوئے ہیں۔ مذکورہ ناقدوں نے بہار ہی نہیں بلکہ بین القوامی سطح پر اردو ادب کی نمائندگی کرتے ہیں اور بغیر ان کے اردو کی کوئی بھی محفل منعقد نہیں ہوئی۔ ان لوگوں نے اپنی تنقیدی صلاحیت اور بصیرت سے ایک بڑے طبقہ کو متاثر کیا۔

بہار میں اردو افسانہ نگاری

افسانہ کہانی کا ادبی نام ہے جس میں افسانہ نگار اپنے تجربے و شاہدے یا کسی واقعہ سے متاثر ہو کر شگفتہ اور پر کشش انداز میں واقعات کا پر لطف طریقے سے اظہار ہے یہ اظہار ایسے پیرائے میں ہو کہ قاری محو تماشہ ہو جائے اور کم سے کم وقتوں میں تفریح طبع اور ذہنی آسودگی حاصل ہو جائے کیوں نکہ کہانی کہنا اور سننا انسانی فطری عادت ہے اس طرح کے عمل سے دونوں کے ذہن کو سکون اور دل و دماغ کو راحت و انبساط حاصل ہوتی ہے۔ ابتدا میں کہانی طویل اور کہانی در کہانی ہوا کرتی تھی جسے داستان کہتے ہیں بعد میں مغربی ادیبوں نے اسے تخفیف کر کے ناول کا نام دیا یہی کہانی صنعتی انقلاب کی وجہ سے مصروفیات زندگی بڑھی اور تفریحات کے اوقات میں کمی آ گئی اور ناول سے افسانہ، مختصر افسانہ منی افسانہ یا مختصر ترین افسانہ کی بنیاد رکھی گئی جس میں قاری کو مختصر وقفے میں وہ تمام مسرت حاصل ہو جائے جو تشکیل روح اور سکون قلب کے لئے ضروری ہے۔

افسانہ ایک ایسی فکری داستان ہے جس میں کسی ایک خاص واقعہ پر روشنی ڈالی گئی ہو اس میں پلاٹ اور اس پلاٹ کے واقعات کی تفصیل اس طرح کی گئی ہو اور بیان اس قدر منظم ہو کہ ایک درد و تاثر پیدا کر دے ساتھ ہی واقعات کی ترتیب میں وحدت تاثر اور دیگر تمام دوسری وحدتیں موجود ہوں۔ افسانے کا اختصار اس کا اولین وصف ہے قاری مختصر اوقات میں پڑھ کر اپنے دل کے لئے تسکین، سرور و انبساط کے سامان فراہم کر لیتا ہے اس کی دیگر صفتوں میں ربط واقعات ہے جو ایک مربوط انداز میں ہوتا کہ تسلسل و دلچسپی برقرار رہے اور افسانہ نگار لہجے اور انداز پیش کش میں ہم آہنگی قائم رکھے تکنیکی اور ہیتی اعتبار سے افسانہ یا مختصر افسانہ فطری اور غیر فطری واقعات و حادثات پر مبنی زندگی کے صرف ایک پہلو اور اس سے منسلک دیگر دوسرے کردار پر پر مسرت یا الم انگیز واقعہ کا ذکر ہوتا ہے افسانہ میں کہانی کی ترتیب میں ایک عمدہ پلاٹ ہو جس پر کہانی کردار کے سہارے بہ حسن خوبی آگے کی طرف بڑھتی رہے، واقعات کی ابتداء سے انتہا تک کا سفر اور اس کے موزوں و موثر نتیجے پر اختتام کی ترتیب و تنظیم پلاٹ ہے۔

افسانے کا ایک اہم جز کردار ہے کہانی کردار کے ذریعہ ہی آگے بڑھتی ہے اور اپنے انجام تک پہنچا ہے۔ افسانہ میں کردار کی محض ایک جھلک دکھائی جاتی ہے کیونکہ افسانہ نگار کو کردار کی پوری زندگی سے تعلق نہیں ہوتا وہ صرف اس کا ایک رخ دکھاتا ہے اس کا پورا ارتقاء ہمارے سامنے نہیں ہوتا اور ہوتا بھی ہے

تو اسے اشاروں، کنایوں کے ذریعہ پیش کیا جاتا ہے اور قاری کا ذہن خود بخود اسے پورا کر لیتا ہے۔ افسانہ میں مطالب کی بھی اہمیت خاص توجہ طلب ہوتی ہے اس میں مکالمہ کو مختصر، موثر، جاذب اور برمحل ہونا چاہئے جو افسانے کو پر تاثر بنانے اور اس طبقہ کی نمائندگی ہو جائے جس ماحول میں کہانی نسو و نما ہوئی ہے غرضکہ اگر افسانہ نگار گاؤں کے ایک لاعلم شخص کا ذکر کر رہا ہو تو اس کی زبان سے افسانہ نگار عمدہ انگریزی یا اردو کے لہجے کو ادا کرائے تو غیر فعلی و غیر فطری اور دلکش منظر نگاری سے کہانی کے لباس کو رنگ و روغن بخشتا ہے۔

افسانہ میں منظر کے ساتھ ساتھ پس منظر بھی خاصی توجہ کا حامل ہے کیوں کہ پش منظر کے ذریعہ ہی افسانہ نگار کردار، واقعات اور کہانی کو پس منظر کے ذریعہ افسانوں کو پسندیدہ رنگ دیتا ہے۔ افسانہ میں اسلوب کی بھی اہمت مسلم ہے۔ اسلوب ہی افسانہ کی کامیابی کا ذریعہ بنتی ہے اس میں لفظوں کا انتخاب فقروں کی چستی اور برجستہ و برمحل جملوں کی ساخت سے افسانہ کو بنایا جاتا ہے۔

فنی ترتیب و ہیٔت میں خاص طور سے واقعہ کا وجود، اس میں پیچیدگی، اس کی اضطرابی کیفیت اور نقطہ عروج ان تمام اجزاء میں فطری ربطہ کا ہونا ضروری ہے۔ کہانی کی ابتدا خوش گوار ماحول میں ہوتی ہے اور آہستہ آہستہ اس میں کشمکش یا تصادم کا آغاز ہوتا ہے پھر ختم ہو جاتی ہے اس میں حسن بیانی یعنی لطف زبان اور تخیلی انداز بیان کے ذریعہ تجسس و دلچسپی قائم رکھتے اختصار کے ساتھ کہانی کا خاتمہ ہوتا ہے۔ افسانہ میں کہانی کی مناسبت سے عنوان رکھتا ہے جسے دیکھتے ہی قاری کا دل اس کی طرف متوجہ ہو جائے۔ افسانے کا آغاز بھی ایک اہم عنصر ہے اس میں افسانہ نگار اپنی جولان طبیعت کا مظاہرہ کرتے ہوئے دلچسپی کی بنیاد رکھتا ہے۔ فنی اعتبار سے اہم یہ ہے کہ افسانہ نگار اپنے ادائے پیش کش سے قاری کو تحریک دے کہ وہ من لگا کر اسکا مطالعہ کرے اور اس انہماک سے کرے کہ وہ اس کے ہر ایک پہلو میں زم ہو جائے افسانے میں نقطہ نظر کی خاص اہمیت و افادیت ہے کیونکہ افسانہ نگار کا کہانی کے در پردہ کوئی نہ کوئی سندیش یا مقصد پوشیدہ ہوتا ہے جو کہانی کی تخلیق کا سبب بنتی ہے اسکا خاتمہ بھی خاس توجہ کا حامل ہوتا ہے۔ کہانی اپنے انتہا تک پہنچ کر اسکا خاتمہ ایک موثر طریقے سے کرنا چاہئے تاکہ قاری کے دل و دماغ میں اس کا انجام نقش ہو جائے۔ جہاں تک اس کے روپ کا سوال ہے تو اب تک کے مطالعہ سے جو بات چھن کہ آئی ہے اس میں رومانی افسانہ، اصلاحی، ترقی پسند، نفسیاتی علامتی اور جدید نظریاتی افسانہ وغیرہ ہیں۔

اردو ادب میں افسانہ نگاری کی ابتدا پریم چند اور سجاد حیدر یلدرم کے ہاتھوں ہوئی دونوں نے اپنا اپنا ایک مشبہ نظر قائم کیا پریم چند نے نے گاؤں، کھیت اور کھلیان میں بکھری ہوئی بے شمار حقیقی واقعات کو کہانی کا روپ دیا وہیں سجاد یلدرم نے شہروں کے اعلیٰ طبقہ میں مسرت و انبساط کو حاصل مقصد بنایا اس

طرح دونوں نے الگ الگ طبقہ یعنی غریب اور امیر کے درمیان حد فاضل قائم ہوگئی۔اس کے بعد دونوں مکتبہ فکر کی پیروی میں افسانہ تخلیق کرنے لگے اور ساتھ ہی سات عالم انسانیت پر وقوع پزیر ہونے والے سیاسی وسماجی اثرات نے پوری طرح ادیبوں کو متاثر کیا اور مختلف نظریاتی افسانے تخلیق ہونے لگے۔افسانہ نگاری کے سفر میں بہار کے افسانہ نگار بھی دوش بدوش رہے۔بیسویں صدی کے ابتداء ہی سے بہار میں اردو افسانہ نگاری کی ابتدا ہو چکی تھی یا یوں کہیں کہ جب پریم چند نے افسانہ لکھنا شروع کیا تھا اس سے قبل بہار کے علی محمود کا ۱۹۰۴ء میں افسانہ شائع ہوا تھا اور مسلم عظیم آبادی کا افسانہ ۱۹۱۴ء میں چھپا۔اس طرح علی محمود، مسلم عظیم آبادی، نورالہدیٰ ندوی، علی اکبر کاظمی وغیرہ نے بہار میں اردو افسانہ نگاری کی بنیاد رکھی۔اور طبقاتی ونظریائی تاثر سے مبرا نہیں رہ سکے۔بہار کے افسانہ نگار کچھ نے پریم چند کی پیروی میں بہار کے کھیتوں، کھلیانوں اور گاؤں کے پرکیف و درد آگیں ماحول کی عکاسی کی ہے وہیں پرمسرت ماحول میں زندگی بسر کر رہے لوگوں کی الجھنوں اور اس ماحول میں رونما ہونے والے واقعات کو افسانوی رنگ دیکر اس کی نکتہ آفرینی کی گئی ہے بہار کے مشہور ومعروفت افسانہ نگار اختر اورینوی اور سہیل عظیم آبادی متذکرہ دونوں طبقوں اور نظریوں کی ترجمانی میں مہارت فن کا مظاہرہ کیا ہے۔

اردو ادب کے افسانوی دنیا میں بہار کے افسانہ نگار اختر اورینوی اعلیٰ وارفع مقام پر جلوہ افروز ہیں اردو کی افسانوی ادب میں ان کی شہرت اور مقبولیت یگانہ ہے۔انہوں نے افسانہ نگاری کا آغاز دیہاتی پس منظر میں ان کے مسائل سے روبرو ہوتے ہوئے دوچار ہوئے ہیں اور اس کی اصل خدوخال میں بے چارگی و بےبسی نے زندگی کی ماہیت سے بےخبر کسانوں ومزدوروں کی مصوری کی ہے لیکن بہت جلد انہوں نے دیکھا کہ شہر جہاں روشنی کی چمک دمک آنکھوں کو خیرہ کر رہی ہے وہیں شہر میں بے روزگار، مفقل حال اور فٹ پات پر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہونے والا طبقہ کس کشمکش کی حالت میں زندگی جیسے انمول جوہر کو تباہ کر رہا ہے کی نمائندگی کرتے ہیں۔اختر اورینوی ایک حساس انسان تھے ان کے افسانوں میں بھی ان کے دلوں کی دھڑکن کی گونج صاف سنائی دیتی۔کرب میں ڈوبی ہوئی معاشرہ جس میں وہ سانس لینے کے لئے مجبور ہیں کتنا مضمحل اور پژمردہ ہے۔ان کا افسانہ بیل گاڑی ہو یا ئپٹ، کوئلے والا۔ شادی کے تحفے، ڈائنامیٹ، اور بھول بھلیا وغیرہ میں جس طبقہ کی نمائندگی کی ہے اس میں اختر اورینوی کا دھڑکتا ہوا دل نظر آتا ہے۔

سہیل اعظیم آبادی پریم چند کے فکر کی نمائندگی کرنے میں اردو ادب کے یکتا افسانہ نگار ہیں جنہوں نے مکمل طور پر پریم چند کے نظریہ اور فکر کو اختیار کیا اور وہی طبقاتی کشمکش گاؤں کے بھولے بھالے

کسان ومزدور کی بے بسی، ان پر حاکموں سیٹھوں اور جاگرداروں کے ظلم وبربریت کی ترجمانی نہایت ہی پر تاثر انداز میں کی ہے۔ انہوں نے افسانوں میں جس جگہ او جو موضوع کہانی کے لئے منتخب کیا اسلوب اور انداز بیان جو اختیار کیا اسے دیکھنے سے یہ تمیز نہیں ہوتا ہے کہ پیش نظر افسانہ سہیل عظیم آبادی کی ہے یا پریم چند کی۔ ان کے افسانوں کے مطالعہ سے قاری اس طرح محو ہو جاتا ہے کہ افسانہ حقیقت کا رنگ اختیار کر لیتا ہے اور نتیجہ اخز کرتے وقت اس کے جذبات برانگیختہ ہوجاتے ہیں۔ ان کے افسانوں یں ''الاؤ'' برسا بھگوان' کاغذ کی ناؤ عبرت' ایک سوال' کمزوری اور ایک دن کی بات وغیرہ افسانوں میں فنی صناعی اور چابکدشتی سے بہار کے گاؤں اور اس کے افراد کی تصویر کسی اس خوبصورت انداز میں کی ہے کہ دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ سہیل اعظیم آبادی کا ربطہ وضبطہ عوامی زندگی سے گہرا ہونے کی وجہ سے عوامی مسائل اور موضوعات کو بالکل قریب سے دیکھا اور اس کا مشاہدی کیا پھر صفحہ قرطاس پر ایسے پر تاثر انداز میں پیش کیا کہ سخت گیر رویہ اختیار کرنے والے ناقدین نے بھی ان کے افسانوں کی تعریف کئے بغیر نہ رہ سکے۔

اردو کے افسانوی ادب میں بہار کے جو نام محترم ہیں ان میں ایک نام سین مظفر پوری بھی ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں طبقاتی کشمکش' معاشی بدحالی' سماجی ناہمواری' گھریلو زندگی میں نا اتفاقی' ہندوستانی معاشرہ فرقہ وارایت اور فرقہ پرستی کا شکار ہو گیا ہے اخلاقی قدریں اس قدر گر گئی ہیں کہ توازن قائم رکھنا دشوار ہو رہا ہے۔ فسادات جیسے مہلک مرض نے دو قوموں کے درمیان حد فاضل کھڑی کر دی ہے جسکا خمیازہ انسانیت کو اٹھانی پڑ رہی ہے اور نفسیات کا بڑھتا ہوا دبا معاشرہ کو شرمشار کئے دے رہا ہے جیسے موضوعات پر قلم اٹھا کر شین مظفر پوری نے پورے طور پر ادب میں تمام فکر کو جھنجھور کر مستقبل کے بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ ان کے افسانوں میں ان کے وسیع اور گہرے مشاہدے کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ ان کے افسانوں کے زیادہ تر کردار مسلم گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ وہ طبقہ ہے جو جہالت عزیت وافلاس کی گہری کھائیوں میں دفن ہوتا جا رہا ہے سین مظفر پوری ایک افسانہ نگار تھے جن کے پاس اپنا یا کوئی دوسرا فلسفاء حیات نہیں تھا بلکہ وہ روز مرہ کی زندگی سے جو تجربہ ومشاہدہ حاصل کرتے یا جس سے وہ بری طرح متاثر ہوئے اسے افسانوں خدوخال میں قاری کے سامنے پیش کر دیتے۔ ان کے افسانوں میں' طلاق طلاق طلاق' حلالیہ' سرخ لہو اور سفید دودھ' دیا نگر کی مسجد وغیرہ میں ان کے نظریوں کی عکاسی ہوتی ہے۔

اردو افسانوی ادب میں بہار کی نمائندگی کرنے والی خواتین افسانہ نگار کی حیثیت سے شکیلہ ختر کا نام بہت ہی مقبول اور محترم ہے ان کے افسانوں میں اکثریت مسائل نسوانیت اور اس کے نفسیات کی

آئینہ دار ہیں ان کے افسانوں کا موضوع مسلم گھرانوں خصوصاً متوسط طبقہ کی لڑکیوں کی اور ان کے گھروں کی ایسی تصویر پیش کی ہے جن کے چہرے پر امید کے چراغ ٹمٹماتے نظر آتے ہیں جو وقت کے ہاتھوں گرد و غبار میں اٹکے ہوئے ہیں۔ شکیلہ اختر کے افسانوں میں معاشرتی بدحالی دود و کرب میں سسکتی آواز سنائی دیتی ہے ان کے مشہور افسانوں کے ذریعہ متاثر کیا ہے۔ ان کے افسانوں کے مطالعہ سے بتا چلتا ہے کہ اکثریت ذاتیات پر مبنی ہے۔ ذکی انور افسانوی ادب کا ایک مظلوم مقتول افسانہ نگار کا نام ہے جس نے اپنے افسانوں کے ذریعہ اور عملی زندگی میں بھی فرقہ وارائیت کے خلاف الم بغاوت اٹھا رکھی تھی لیکن افسوس حد افسوس کہ انہیں فرقہ پرستوں نے بڑی بے رحمانہ طریقے سے قتل کر دیا۔ ایک ایسا افسانہ نگار جس نے اپنے افسانوں کے ذریعہ پوری عالمی برادری کو متاثر کیا تھا اس کا انجام بہت ہی افسوس ناک ہوا ان کے افسانوں میں رومانیت' مسائل زندگی' سماجی و معاشرتی کشمکش اور فرقہ کی ناہم آہنگی ملتی ہے۔ اس کے علاوہ افسانہ نگاری کی دنیا میں شہرت و مقبولیت حاصل کی ان میں انور عظیم' احمد یوسف' شفع جاوید' ظفر اوگانوی' شفیع مشہدی' عبدالصمد وغیرہ اپنا وقار کو بہت بلند کیا ہے۔

سید محمد محسن اردو کے افسانوی ادب میں بہت ہی محترم اور بزرگ نام ہے۔ انہوں نے افسانہ ''انوکھی مسکراہٹ'' کے ذریعہ وہ شہرت حاصل کی جسکا بدل نہیں، ماہر نفسیات ہونے کی وجہ کر انوکھی مسکراہٹ میں جو نفسیاتی پہلو ابھر کر سامنے آتے ہیں اسکا مثال اردو کے دوسرے افسانوں میں نہیں ملتا ہے۔

معتبر افسانہ نگاروں میں شاہ مقبول احمد' ذکیہ مشہدی' قمر جہاں' عبید قمر شمیم افزا قمر رضوان احمد اور فخر الدین عارفی وغیرہ افسانہ نگاروں نے افسانوی ادب کو پوری طرح متاثر کیا ہے فخر الدین عارفی کی شہرت یافتہ افسانوں میں ''ایک طوفان' تاریک راہوں کے مسافر' ہم سفر' دیوار سلگتے خیموں کا' راستے' بند آنکھوں کی کہانی اور سفر وغیرہ ہیں ان کے افسانوں میں کہانی پن کو واپس لانے کی کوشش ہے جو ترقی پسند تحرک اور جدیدیت کے نام پر تلف ہو چکی ہے آج کا طبقہ خاص و عام مسائل زندگی سے اس طرح برسر پیکار ہے کہ فرصت نہیں ملتی ذلف کا کل سنوارنے کی۔ نئی نسل کے افسانہ نگاروں میں عارفی اور رضوان احمد کی اہمیت و افادیت کو بھی نے تسلیم کیا ہے ان کے ساتھ ہی عالمی شہرت کے مالک کثیر التعداد میں چھپنے والے مناظر عاشقی ہرگانوی پوشیدہ نام نیتا جوگن نے اردو کے افسانوی ادب کو پوری طرح اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔ ان کے افسانوں میں روایتی جمالیات کا عکس نہایت ہی حسین پیرائے میں ملتا ہے۔

اردو افسانہ نگاری میں بہار کے جن لوگوں نے کچھ کر دیکھانے کی سعی کی ہے ان میں حسن نظامی ظہیر نیازی' جاوید اقبال قاسم خورشید' ارتضی کریم' شموئل احمد' نیم محمد جان' نوہد ہاشمی' کہکشاں انجم وغیرہ

کے علاوہ حسین الحق نے ابتداء میں ترقی پسند تحریک سے متاثر ہوکر اور جدیدیت سے ہم کنار ہوتے ہوئے علامتی افسانہ نگاری کی طرف متوجہ ہوئے لیکن بہت ہی جلد اپنا رخ بدل دیا اور افسانہ میں کہانی کی اصلیت و ماہیت کی طرف راغب ہوئے انہوں نے بہت ہی مثالی افسانے تخلیق کئے ہیں۔ان کے افسانوں میں روایت سے بغاوت' عصری تناؤ جدیدیت کا اثر نمایاں ہے اس کے علاوہ ان کے افسانوں میں تقسیم ہند سے سماج میں ابھرنے والے احساس کو پر تاثر انداز میں پیش کیا ہے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اردو کے افسانوں ادب میں بہار کے افسانہ نگاروں کی ایک لمبی فہرست ہے جس کا یہاں ذکر ممکن نہیں۔متذکرہ افسانہ نگاروں نے اردو کی پوری افسانوی ادب کو مفکرانہ' مختلف مکتبہ فکر اور تحریکات سے متاثر کیا ہے۔ان کے یہاں روایت سے لیکر' مارکس فرائڈ' مغربی افسانہ نگاروں کے افکار اور جدید سے جدید تحریکات کی نمائندگی ملتی ہے۔

اردو زبان کی پیدایش

اردو ترکی زبان کا لفظ ہے اس کے لغوی معنی لشکر گاہ کے ہیں بحیثیت زبان وادب کے اس کا نام 1800ء سے تسلیم کیا جاتا ہے کیونکہ جان گلکرائسٹ فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے نگراں اور سرپرست تھے۔ انہوں نے ہی پہلی مرتبہ ہندوستانی زبان کو دو حصوں میں تقسیم کیا ایک کو اردو اور دوسری کو ہندی کے نام سے موسوم کیا۔ اس سے قبل ہندی نام سے دیوناگری لپی میں لکھی جانے والی الگ سے کوئی زبان وادب کا تصور نہیں تھا اور نہ ہی مستقل نام اردو ہی تھا کیوں کہ آج ہم جس زبان کو اردو کے نام سے جانتے ہیں اپنی پیدائش یا ابتداء سے لے کر آج تک کئی ناموں سے جانی جاتی رہی ہے۔ مثلاً ہندی، ہندوی، ریختی اور دکنی وغیرہ

اردو کی پیدائش کے سلسلے میں ماہر لسانیات نے اب تک کئی نظریے پیش کر چکے ہیں جو بھی کسی نہ کسی جہت سے قابل قبول ہے۔ اگر ہم اب تک کے تمام نظریوں کو تسلیم کر لیتے ہیں تو یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ اردو کسی خاص علاقہ یا خطہ میں پیدا نہیں ہوئی ہے بلکہ اس کا بیج ہندوستان کی مٹی سے نمو پا کر جواں ہوئی ہے اور اس کے ابتدائی نمونے پورے ہندوستان میں کہیں کم کہیں زیادہ پائے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کے ابتدائی عہد سے لیکر آج تک پورے ہندوستان کی اگر کوئی مشترکہ زبان تھی تو وہ اردو تھی اردو ہی ایک ایسی زبان ہے جو پورے ہندوستان میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ لسانی اعتبار سے اسکا تجزیہ کرتے ہیں تو ہمیں یہ دیکھنے کو ملتا ہے کہ اردو زبان کی بیج کہیں سے آئی، مٹی کہیں اور سے ملی، پرورش کہیں اور ہوئی اور ساتھ ساتھ جوانی کی تابانی کہیں اور دستیاب ہوئی۔ اب تک کے لسانی تحقیقات سے یہ پتا چلتا ہے کہ اردو کی پیدائش کے سلسلے ہیں اوّل تو فاتحین دوئم صوفیائے کرام، سوئم تجار کا اہم کردار رہا ہے۔

کسی نئی زبان کے بننے کا یہ اصول ہے کہ دو یا کئی زبانوں کے آپسی تعلق سے ایک نئی زبان پیدا ہوتی ہے۔ اردو زبان بھی اسی قائدے کے مطابق عربی فارسی پراکرت کھڑی بولی اور دیگر مقامی زبان کے آپسی میل سے وجود میں آئی پہلا قافلہ عربوں کا ہے جو خطۂ عرب سے بہ غرض تجارت کرنے بحر ہند کے راستے اسلام سے قبل عرب تجار ارض ہند کے مالا بار میں قدم رکھا۔ اس کے علاوہ سرن دیپ اور کالی کٹ کے بندرگاہوں تک پہنچ کر اپنا سامان فروخت کرتے اور پھر یہاں سے مسالہ وغیرہ لیکر عرب ممالک لوٹ جاتے۔ ان تجارتی رابطہ سے ایک بڑا طبقہ عربوں کا ان بندرگاہوں کے قریب مستقل سکونت اختیار کر لی ان

لوگوں کے سکونت اختیار کرنے سے یہ ہوا کہ عربی چیزوں کے نام اور بول چال کے الفاظ مختصر تبدیلیوں کے بعد خرید وفروخت کے ساتھ ہندوستان کے ساحلی علاقوں سے اندرون ملک پھیلتا گیا جو اندرون ملک بولی جانے والی مختلف زبانوں کے اختلاط سے ایک نئی زبان کی بیج بونے کا کام ہونے لگا۔ تاجروں کا قافلہ عربی زبان بولتے تھے اس لئے عربی زبان کے بے شمار الفاظ مقامی زبانوں میں خلط ملط ہو گئے جیسا کہ تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ مہابھارت میں بھشم پتامحل میں مباحثوں کے دوران عربی زبان کے کئی جملے بطور مثال دہرائے تھے۔

دوسرا قافلہ جو ہندوستان کی سرزمیں پہ وارد ہوا وہ فاتحین کا تھا فاتحین میں سب سے پہلا نام محمد بن قاسم کا آتا ہے جو 720ء میں سندھ پر قبضہ کر کے اپنی حکومت قائم کی تھی۔ جس کی وجہ سے وہاں عربی و فارسی کے الفاظ مقامی زبان میں استعمال ہونے لگے تھے۔

محمود غزنوی کے زمانے میں اور اس کے بعد بھی ردوبدل ہوتی رہی 1000ء سے افغانستان کے راستے مسلم حکمراں ہندوستان پر حملہ ور ہوئے ان کا مرکز اور پہلا پڑاؤ پنجاب ہوا کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کے ابتدائی نمونے پنجاب میں زیادہ ملتے ہیں کیونکہ محمد بن قاسم کے بعد جتنے بھی بادشاہ ہندوستان آئے اور ان کی لشکریوں کی زبان فارسی تھی لہذا عربی و فارسی الفاظ ہندوستان کی زبانوں میں اور عربی فارسی میں ہندوستانی زبانوں کے الفط بڑی تیزی سے شامل ہونے لگے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ اور ان کی زبانیں ایک دوسرے سے قریب تر ہوتے گئے۔ قربت کا سب سے اہم کردار فوجیوں کا رہا ہے کیونکہ سلاطین وقت کا ربط مخصوص لوگوں تک محدود تھا لیکن فوجیوں کا ربط رہن سہن، میل جول خرید وفرخت اور ضروریات زندگی کی حصولیابی کے لئے عام لوگوں تک کی رسائی حاصل کرنی پڑتی تھی اور دونوں کو ایک دوسرے کی زبان کو سمجھنے اور بولنے کا موقع بھی ملتا تھا اس کی سب سے بری وجہ فوجیوں کا اندرون ملک میں پھیلنا اور مقامی لوگوں کا سلاطین کی فوج میں بھرتی ہونا بھی رہا ہے۔

اردو کی پیدائش کے سلسلے میں صوفیائے کرام کا کردار بہت ہی اہم رہا ہے کیونکہ جتنے بھی صوفی بزرگ رسل وحدایت کی عرض سے ہندوستان آئے وہ سبھی فارسی اور عربی بولتے تھے۔ صوفیوں کا مسکن دور دراز کے قسبوں اور گاؤں کے عام لوگوں کے درمیان رہا۔ زیادہ تر صوفی اندرون ملک گھوم گھوم کر اسلامی تعلیمات کو لوگوں تک پہنچایا یہ لوگ جس علاقہ یا خطہ میں قدم رنجہ فرماتے۔ وہاں کے جاگردار اور عوام دونوں کو اسلامی تعلیمات سے روشناس کراتے تھے۔ صوفیوں کے ان کاموں میں مقامی زبانوں کا ربطہ ہوا کرتا تھا۔ لہذا صوفیوں کی زبان فارسی وعربی ہوا کرتی تھی لیکن انکارات دن کا میل ملاپ عوام الناس

سے ہوتا تھا اوران کی زبان ہندوستان کی مقامی زبانیں ہوا کرتی تھی اس لئے صوفیوں نے اپنے دائرہ عمل میں آنے والے لوگوں اور مشرف بہ اسلام ہونے والے لوگوں کو ان کی ہی زبان میں اللہ اور رسول کی تعلیمات دینے کی کوشش کرنے لگے جس سے فارسی وعربی کا براہ راست ربطہ مقامی زبانوں سے ہوا اور دو مختلف زبان بولنے والے اشارے کنائے اور ٹوٹی پھوٹی مخلوط زبان کے ذریعے اپنے مقاصد کو شاگردوں تک پہنچانے کا کام کرنے لگے۔ اس سے یہ ہوا کہ عربی و فارسی کے الفاظ تیزی کے ساتھ مقامی زبان میں ملنے لگے۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کے دونوں کے درمیان لسانی دوریاں ختم ہوگئی اور ایک نئی زبان یا بولی رائج ہوگئی۔

ایک طرف تاجروں کی چیزوں کے نام اور طور طریقے رسم ورواج کا دخول ہوا تو دوسری طرف حاکم وقت کی طبع میں محکوموں نے سرکاری زبان کو اختیار کرنے لگے جس میں سب سے اہم کام فوجیوں کا رہا ہے تیسرا طبقہ جو عام ہندوستانیوں کے دلوں تک پہنچ کر اپنی متانت سنجیدگی اور اسلام کی خوبیوں سے منور ایمانداری، دیانت داری، حقوق اور انصاف کے ساتھ اس درمیان صوفیوں کی زبان میں مقامی زبان ورسم وارواج کا دخول پھر عربی وفارسی الفاظ کا مقامی زبان میں داخل ہونا ایک نئی زبان کو جنم دے رہی تھی آہستہ آہستہ لوگ تقریباً پورے ہندوستان میں ایک ایسی زبان بولنے اور سمجھنے لگے تھے کہ جسکا نہ کوئی اپنا اصول وظوابطہ تھے اور نہ ہی کوئی لسانی تاریخ اور نہ ہی کوئی رسم الخط ہی تھا۔ مقامی زبان تھی جسے لوگ آسانی روانی کے ساتھ بولتے او سمجھتے تھے۔

اب تک ہمارے سامنے ماہر لسانیات نے اردو کی پیدائش کے سلسلے میں جو نظریہ پیش کیا ہے اس ضمن میں سب سے پہلے آب حیات کے مصنف محمد حسین آزاد نے اردو کی پیدائش کے سلسلے میں لکھا ہے کہ اردو کی پیدائش کھڑی بولی سے ہوئی ہے اور اسکا مسکن دوآب کا علاقہ رہا ہے۔ انکے بیان کے تصدیق میں گریرسن، سبز باری وغیرہ علماء نے تفصیل سے بحث کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اردو کی جائے پیدائش گنگا جمنا کے ملاپ کا استھان مطلب آلہ آباد اور اس کے گردولواح کا خطہ قرار دیا جاتا ہے۔ دوسرا نظریہ پنجاب میں اردو ہے اس نظریئے کی وضاحت محمود شیرانی جمیل جالبی اور دیگر لسانی محقیق کا ماننا ہے کہ اردو کی پیدائش پنجاب میں ہوئی ہے اور اس کے جو وجوہات وشواہد پیش کئے گئے ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اردو کی پیدائش پنجاب میں ہوئی ہے تیسرا نظریہ نصر الدین ہاشمی اور شمش القادری اور سید سلمان ندوی کا ہے انہوں نے اپنی کتاب عرب و ہند کے تعلقات میں لکھا ہے کہ اردو کی پیدائش دکن میں ہوئی ہے اور انہوں نے جو مشواہد پیش کئے ہیں وہ بھی قریب القیاس ہے کہ اردو کا پہلا گہوارہ دکن ہی رہا ہوگا چوتھا

نظریہ بہار میں اردو ہے اس کے مبلغ سید اختر اورینوی اپنی کتاب ''بہار میں اردو زبان کا ارتقاء'' میں لکھا ہے کہ اردو کے ابتدائی نمونے بہار میں ملتے ہیں ان کے اسی نظریہ کی پیروی سید مظفر اقبال نے بھی اپنی کتاب بہار میں اردو 1914 تک میں کی ہے اور حال ہی میں ایک محقق نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ کھڑی بولی دراصل اڑیسہ کی اُڑیہ زبان کھڑ سے نکلی ہے اور کھڑی سے اردو نکلی ہے اس طرح اردو کی پیدائش اُڑیسہ میں ہوئی ہے۔

مجھے ان نظریوں میں الجھنے کی ضرورت نہیں ہے لیکن مذکورہ تمام نظریوں کے مطالعہ سے یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ اردو کسی ایک مقام اور جگہ میں پیدا نہیں ہوئی ہے بلکہ اس کی پیدائش کے کئی وجوہات رہے ہیں من جملے میں اس رائے اور خیال سے متفق ہوں کہ ہندوستان کی ہندوستانی زبان جسے امیر خسرو نے ہندی، ہندوی کہا اور غالبؔ نے ریختی کے نام سے یاد کیا ہے دراصل ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی مشترکہ علامت اردو ہے جس کے اندر ہندوستان کی سبھی بولیوں کے لفظوں کے ذخائر موجود ہیں اردو اصل میں ہندوستانی زبان ہے اب اسے چاہیں جس نام سے پکاریں۔

☆☆☆

دکن میں اردو ادب

اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو زبان کے ابتدائی نمونے شمالی ہندوستان میں ملتے ہیں اور اس کی پرورش و پرداخت دکن میں ہوئی۔ علاء الدین خلجی کے زمانے سے دکن پر شمالی ہند کے حملے شروع ہو گئے تھے اور آمد و رفت کا سلسلہ بھی جاری ہو گیا تھا 1329ء محمد تغلق نے دیوگری شہر کو اپنا دارالسلطنت بنایا محمد تغلق کو یہ شہر اتنا پسند آیا کہ اس نے حکم دیا کہ ہر شخص دہلی سے دکن چلا جائے۔ شاہی حکم تھا اس لئے دہلی کی ساری آبادی دکن منتقل ہو گئی یہ لوگ اپنے ساتھ نئی زبان بھی لیتے گئے اس نئی زبان کا اثر اس تیزی سے ہوا کہ دکن والوں نے اس زبان کو اپنے یہاں کی بولیوں میں شامل کر کے دکنی اردو کا نیا باب کھول دیا عوام و خواص اس میں دلچسپی لینے لگے بزرگوں نے اپنے خیالات کا اظہار اسی زبان میں کرنے لگے جس سے اس زبان کو زیادہ مقبولیت ہوئی چنانچہ دکن میں اردو کے ابتدائی نمونے اُسی وقت سے ملتے ہیں دکن میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ اردو میں بہمی دور میں شروع ہوتا ہے ابتداء میں بندہ نواز گیسو دراز فیروز شاہ بہمی کے دور میں گل برگا تشریف لائے اور رسل و ہدایت کے کاموں میں مشغول ہو گئے۔ ان کے تین رسالے تصوف کے ملتے ہی (۱) معراج العاشقین (۲) ہدایت نامہ (۳) سہ بارہ

بندہ نواز گیسو دراز کا رسالہ جو تصوف میں ہے ان کے بعد کئی بزرگوں کے مذہبی رسالے ملتے ہیں جو دکن میں اردو زبان کے ابتدائی نمونوں میں شمار کئے گئے ہیں اسے قدیم اردو کا نام دیا گیا ہے مثلاً میران جی کا ''خوش نامہ اور ''شہادت الحقیقت'' شاہ برہان الدین خاتم کا ''وصیت الہادی'' اور 'بشارت الذکر متذکرہ رسالہ صوفیانہ ہے۔ ان صوفیوں کے دور میں اردو زبان دکن میں خوب اچھی طرح بولی اور سمجھی جانے لگی تھی۔ اس دور میں بڑے بڑے شعراء نے بھی فارسی سے ہٹ کر اردو میں اپنے زوق کی تسکین کرنے لگے تھے۔ علی عادل شاہ کا درباری شاعر جس نے ملک الشعراء کا خطاب حاصل کیا نصرتی اردو کا شاعر تھا نصرتی کی تین تصنیف ہیں (۱) مثنوی گلشن عشق۔ اس میں کنور منوہر اور مد مالتی کا قصہ بیان کیا گیا ہے (۲) علی نامہ میں بادشاہ علی عادل شاہ کے واقعات اور قصائد ہیں اور (۳) تاریخ اسکندری

سید میران ہاشمی، یہ ایک غزل گو شاعر تھے۔ ان کا ایک دیوان غزل کا ہے لیکن ان کی شہرت

سب سے زیادہ مثنوی ''یوسف زلیخا'' کی وجہ سے ہوئی۔ دکن میں اور زبان کی ترقی اس قدر ہوئی کہ بہمن حکمرانوں نے اس کی سرپرستی تو کی اور ساتھ ہی بادشاہ محمد قلی قطب شاہ نے اردو زبان میں زوق فرمانے لگے اور کہا جاتا ہے کہ محمد قلی قطب شاہ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر بھی ہے۔ دکن کے شاعروں میں جس نے بہت زیادہ شہرت حاصل کی اس میں ملا وجہی ایک اہم نام ہے مثنوی ''قطب مشتری اور نثر میں ''سب رس'' قطب مشتری میں بادشاہ کی تعریف اور اس کے عشق کی داستان بڑی خوبی اور سلیقے سے قلم بند کی گئی ہے ''سب رس'' قصۂ حسن ودل کے پیرائے میں تصوف کے مسائل نہایت خوب اسلوبی سے تمثیلی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

وجہی کے زمانہ میں اور ان کے بعد دکن میں بے شمار شعرا ہوئے ان میں کچھ نے بے شک اپنی اچھی تصانیف کی وجہ کر زندہ جاوید ہیں مثلاً شوقی، غواصی، ابن نشاطی اور فائز وغیرہ شاعروں نے دکن میں اردو کو خوب خوب پر اوان چڑھایا اور اردو زبان کو ایک نہج پر لاکر کھڑا کر دیا ان ہی لوگوں میں ایک نام ولی کا آتا ہے ولی کو کچھ لوگ اورنگ آبادی کہتے ہیں اور کچھ ولی دکنی بھی کہتے ہیں۔ بہرکیف ولی دکن کا ایک ایسا شاعر ہے جس نے جنوب کو شمالی سے جوڑنے کا کام کیا ہے الغرض یہ کہ ولی دکنی اپنا دیوان لیکر شمالی ہند یعنی دہلی آئے تو ان کے زبان کی چاشنی، جاذبیت اور مٹھاس نے سبھی فارسی گو شاعروں کو اپنا گرویدہ بنالیا۔

کلیات ولی کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے اردو کے تقریباً سبھی صنفوں پر طبع آزمائی کی ہے۔ غزل، قصیدہ، رباعی، مثنوی وغیرہ اور تمام اصناف شاعری کو ولی نے نہایت ہی خوبی اور کامیابی سے نبایا ہے۔ ان کی غزلوں کی زبان آج کے قریب تر ہیں انکا تغزل معرکۃ الآرا ہیں زبان سیدھی اسلوب سادہ بیان میں پاکیزگی ہے سلاست اور روانی ان کے کلام کا خاصہ ہے۔

تجھ لب کی صفت لعل وبدخشاں سوں کہوں گا
جادو ہے تیرے نین غزالاں سوں کہوں گا

ولی کے اخلاقی مضامین میں گہرائی تصوف کی چاشنی رموز حقائق کو تغزل کے رنگ میں اس طرح پیش کرتے ہیں کہ قاری کے دلوں پر گہرا نقش چھوڑ جاتا ہے۔

اس میں کوئی شک وشبہ کی بات نہیں کہ اردو ادب کی ابتداء شمال میں ہوئی امیر خسرو کے بعد ایک لمبا گیپ ہے اور اس زبان کو جلا دکن نے بخشی دکنی ادب میں اردو کے تمام اصناف سخن کو رواج عام اور شہرت دوام حاصل ہوئی۔ دکنی ادب میں غزلوں پر مقامی تخیل نمایاں ہے۔ قصیدہ نگاری دکنی ادب میں کم ہے صرف نصرتی ایک ایسا شاعر ہے جس کو ایک بلند پایہ قصیدہ گو کہا جا سکتا ہے۔ دکنی ادب میں دو صنف سخن نے

خصوصیت کے ساتھ عروج پائی ان میں مثنوی اور مرثیہ ہے مثنوی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ دکن کا شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہوگا جس نے مثنوی نہ کہی ہو۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ مثنوی دکن میں خوب پروان چڑھی اور اردو کی مشہور و معروف مثنویاں دکن ہی میں لکھی گئی ہیں۔اس صنف میں مذہبی مثنوی جو صوفیانہ مسائل سے پر ہیں مثلاً جانم کی مثنویاں۔غواصی کی 'سیف الملوک دو بدیع الجمال، جنیدگی کی 'انا پیکر' طبعی کی ''بہرام گل اندام'' فائز کی ''رضوان شاہ اور روح افزا'' عاجز کی قصہ ''دل گوہر و غیرہ عشقیہ مثنویاں ہیں۔

دکنی ادب میں اردو کی بہترین مثنویاں اردو ادب کے قالب میں ڈھالی گئیں۔فارسی کی مشہور مثنوی یوسف زلیخا کو ہاشمی اور امین نے اردو میں لکھ کر خزانہ ادب میں اضافہ کیا ہے اسی دور میں سوانح عمری مثنوی کی ہیت میں لکھی گئی۔نصرتی کا علی نامہ اور مومن کا اسرار عشق بہت مشہور ہیں دکن کے رسم و رواج اور طور طریق کی مکمل تصویریں کرتی ہیں نصرتی کا علی نامہ ابن نشاطی کی پھول بن'' ایک عشقیہ مثنوی ہے جو اپنے عہد کی طرز معاشرت رسم و رواج اور سیاسی وسماجی حالات کا ایک بہترین مرقع ہے انہیں مثنویوں کے بیچ میں ہمیں ایسے بیانیہ ٹکڑے مل جاتے ہے جو مثنوی سے علحدہ کرنے کے بعد ہمارے لئے مستقل نظموں کا کام دیتے ہیں۔مثنویوں میں عاشقانہ، بیانیہ، رزمیہ اور بزمیہ ہیں۔

مرثیہ اردو ادب کا ایک اہم اور عقیدے کے سبب سب سے بڑا صنف سخن ہے مرثیہ کا ابتداء بھی دکن سے ہی ہوئی ہے دکن کے مرثیوں کے ابتدائی دور میں مذہبی ہے عزلت نے مرثیہ کے فن کو عروج دیکر دلوں کو پر تاثر بنانے میں اہم رول نبھایا ہے۔

دکنی ادب میں اردو ادب کے تمام اصناف ادب کے ابتدائی نمونے ملتے ہیں اس میں کچھ صنف تو ایسی ہے جو ابتداء کے ساتھ ہی کمال تک پہنچ گئی ہے۔غزل، قصیدہ، مرثیہ، مثنوی صنفوں کو عروج کمال حاصل ہوئی۔ان کی شہرت اور مقبولیت خواص سے عوام تک یکساں تھی آج بھی جب ہم اردو ادب کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ اردو ادب کو دکنی ادب نے عمدہ تصانیف کے امبار سے مال و مال کر دیا ہے۔اس کی ہی نمائندگی میں شمالی ہند کی ادبی فضا ہموار ہوئی اور آج کے دور تک کمال حاصل کیا۔

مرثیہ نے تو شمال میں آکر مزید عروج حاصل کیا اور انیس و دبیر نے پایہ تکمیل تک پہنچا دیا۔ قصیدہ کے فن کو عروج حاصل ہوا لیکن شمال میں اسے مزید تقویت ملی اور شہنشاہوں کی عزت افزائی اور خود شنائی کو عروج حاصل ہوئی۔ جہاں تک غزل کا سوال ہے تو دکن میں غزل نے اپنے پورے آب و تاب کے ساتھ پروان چڑھی اور اس کی شہرت اور مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب ولی اپنا دیوان لیکر دہلی تشریف لائے تو کہا جاتا ہے کہ لوگوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔گلی کوچوں میں نو جوان

گنگناتے پھرنے لگے قوال اور نقالچیوں نے محفل خواص وعوام میں سنانے لگے ۔اس وقت تک دہلی میں فارسی کلام کا زور تھا لیکن ولؔی کی آمد نے فارسی کے بڑے اور چھوٹے تمام شعراء کو متاثر کیا اور اردو زبان میں شاعری کرنے کے لئے مجبور کر دیا۔

اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ دکن نے اردو ادب کو جلا بخشی اور اصناف سخن کو ایک ہموار راستے پر لا کھڑا کیا جس پر چل کر شمالی ہند کے ادیب وفنکار نے اپنے رتبے اور مرتبے کو بلند کیا۔ جس نے غالبؔ جیسا عظیم شاعر اور اقبالؔ جیسا عظیم مفکر وطن پرست شاعر کو جنم دیا اس لئے دکنی ادب کے خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔
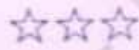
☆☆☆

شمالی ہند میں اردو ادب اٹھارویں صدی تک

شمالی ہند میں اردو ادب کے ابتدائی سفر کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ھے کہ اردو مختلف جہتوں سے نشونما پاکر ادبی شکل اختیار کرنے کے لائق ہوئی تو اسے مسعود سعد سلمانی اور ابو عبداللہ النکتی لاہوری فارسی گو شاعر کا نام محققوں نے لیا ہے کہ ان دونوں نے اردو میں بھی شعر کہے ہیں اور ان کے دیوان بھی تھے لیکن اب تک دستیاب نہ ہونے کی وجہ کر کال عدم قرار دیا جاتا ہے ادبی شکل میں جواب تک تحقیقات کی روشنی میں شبوتوں کے ساتھ ملتا ہے وہ ہے امیر خسروان کے بارے میں کچھ کہنا یا لکھنا عجیب سا لگتا ہے صرف ان کا نام ہی لے لیا جاتا ہے تو پوری محفل روشن نظر آنے لگتی ہے۔ ان کے بارے میں آب حیات سے لیکر آج تک سینکڑوں کتابیں عالم وجود میں آچکی ہیں۔ مثال کے طور پر فارسی واردو آمیز غزل، پہیلیاں، ہکر نیاں ،دوہے، انمل اور طرح طرح کے گیت اور خالق باری جو ایک منظوم لغت ہے امیر خسرو کا فارسی واردو آمیز غزل

زحال مسکیں مکن تغافل دراۓ نیناں بناۓ بتیاں

کہ تاب ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگاۓ چھتیاں

مذکورہ شعر امیر خسرو کی ابتدائی کوشش تھی جس کی تخلیق قصداً نہیں بلکہ خوش طبعی تھی جو بعد میں مشعل راہ ثابت ہوئی۔ یہ اردو کا پہلا قدم تھا جو عالم وجود میں آیا۔ زبان اردو اس زمانے میں ضرورتاً استعمال کی جاتی تھی خط وکتابت اور دفتری کاموں میں فارسی کا چلن تھا۔ شمالی ہند میں امیر خسرو کے بعد تقریباً چارسوسال تک خاموشی رہی پھر ہمیں مغلیہ عہد میں چندر بھان برہمن لاہوری کا نام آتا ہے جو خسرو کے بعد شمالی ہند میں اردو ادب کی ایک کڑی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کا کلام ہے۔

خدا نے کس شہر اندر برہمن کو لاۓ ڈالا ھے

نہ دلبر ھے نہ ساقی ھے نہ شیشہ ھے نہ پیالہ ھے

ان کے بعد شمالی ہند میں اردو کی ادبی سرگرمیاں تیز ہوتی نظر آتی ہیں کیونکہ وَلی دکنی کے شمالی ہند میں قدم رکھنے سے پہلے کچھ ایسے شاعر تھے جو اردو میں اپنا کلام تحریر کیا کرتے تھے ان میں فائز دہلوی کو صاحب دیوان ہونے کا شرف حاصل ہے۔ صدرالدین محمد فائز نہایت ذی علم اور بہت سی کتابوں کے مصنف تھے یہ نثر ونظم فارسی واردو میں یکساں طور پر لکھتے تھے۔ فائز کا اردو دیوان ضخیم نہیں ہے نظم جو مثنوی کی شکل میں ہیں فائز دہلوی شمالی ہند میں دہلی کے پہلے غزل گو اور نظم نگار ہیں۔

نجم الدین آبرو نہایت کہنہ مشق استاد شاعر تھے کلام میں صفائی کے ساتھ رعایت لفظی تخیل میں وسعت الفاظ سادے اور عام فہم ہیں۔ سید محمد شاکر ناجی شمالی ہند کے ابتدائی شاعروں میں شمار کئے جاتے ہیں ان کی طبیعت میں سوخی اور تیزی ہے میر تقی میر ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ناجی لوگوں کو اپنے انداز بیاں اور لفظوں کے تیور سے خوب ہنساتے ہیں خود مہنہ بنائے بیٹھے رہتے۔ شیخ شرف الدین مضمون بھی اسی وقت کے نامور شاعروں میں شمار کئے جاتے ہیں اور غلام مصطفےٰ خان یک رنگ کو مرزا مظہر جان جاناں سے تلمذ حاصل تھا۔ اپنے وقت کے خوش فکر اور باکمال شاعر تھے ان کے دیوان سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا کلام بہ یک وقت مجاز وحقیقت دونوں کا مزا دیتا ہے۔ آرزو کے اردو کلام کا مجموعہ نغز میں غزل کے وہ تمام پہلو پائے جاتے ہیں جو اس وقت کا طرۂ امتیاز تھا۔ خان آرزو اردو کے اچھے اور خوش گو شاعر تھے۔ ان کے ہم عصر شاعر امیر خان انجام فارسی اور اردو دونوں زبان میں شعر کہتے تھے۔ اردو کی خدمت اس طرح کی کہ زبان کی ترقی کے لئے اپنی نگرانی میں ایک انجمن قائم کی جس میں وقت کے فضلا و زبان داں شریک ہوتے الفاظ ومحاورات پر بحث ہوتی اس کے بعد ہی الفاظ ومحاورات کی نقل کر ہندوستان کے مختلف شہروں میں بھیج دیتے جس کی تقلید امرا وشعراء کرتے۔ انجام کی انجمن اور ان کی ذاتی کوشش سے اردو کے الفاظ ومحاورات میں ایک نیا موڑ آیا اور اس کی ترقی کی راہ ہموار ہوئی۔ اس کا اثر ایسا ہوا کہ صاحب حیثیت فارسی شاعروں نے اردو زبان کی طرف متوجہ ہونے لگے۔ ان میں امید، وداد، ندیم، گلشن، فراق، قفر، مرزا عبد القادر بیدل اور آرزو وغیرہ زبان اردو کے فروغ میں ایک اہم کردار نبھانے لگے ۱۸۲۲ء میں ولی کے دہلی آنے سے قبل بھی دکن سے چند شعراء دہلی تشریف لائے تھے لیکن کچھ خاص اثر ان لوگوں کا نہیں ہوا تھا لیکن ولی دکنی کی شمالی ہند میں آمد کے بعد اردو زبان کو بے حد عزت اور شہرت ملی اور قوالوں وارباب نشاط نے ان کی غزلوں سے محفلوں کو گرمادیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ فارسی سے اردو کی جانب بے خطر مخاطب ہونے لگے۔ ان میں خصوصیت کے ساتھ شاہ مبارک آبرو، شاکر ناجی، احسن، حاتم اور فغاں نے اردو زبان کی آبیاری میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دکن کے ابتدائی دور کے مقابلے شمالی ہند کے ابتدائی دور میں شعراء کرام نے زبان کی رنگینی ودلچسپی کو نکھارنے اور الفاظ کو درست کرنے لگے انمیں انجام اور حاتم کے کارنامے قابل احترام ہیں سب سے زیادہ جس نے اردو زبان کی صفائی کی وہ ہیں مرزا مظہر جان جاناں انہوں نے باضابطہ ایک دفتر کھول رکھا تھا جہاں الفاظ کو متروک اور مستند قرار دیا جاتا۔ ان کی اس کوشش سے زبان اردو میں بے شمار بھاشائی الفاظ متروک ہو گئے اور اس کی جگہ عربی وفارسی کے الفاظ کا دخول ہونے لگا۔

شمالی ہند میں اردو ادب اٹھارویں صدی کے آخر تک تمام عیوب سے پاک ہو کر اور نکھر وسنور

کر اپنے شباب میں قدم رکھ چکی تھی مرزا مظہر جان جاناں کی کتر بیوت نے زبان اردو کو ایک نئی راہ اور سمت عطا کی اور اٹھارویں صدی کا آخری دور جسے اردو کا بام عروج بھی کہا جا سکتا ہے اس دور میں اردو کے ایسے باکمال شاعر ہوئے جس پر اردو آج بھی ناز کرتی ہے مرزا محمد رفیع سوداؔ، سوداؔ نازک مزاج اور غیور طبع شاعر تھے ان کی شہرت غزلوں کے علاوہ قصائد، رباعیات، قطعات، مخمس، ترجیع بند، مستزاد مثنویات، سلام اور مراثی میں ہے لیکن سب سے زیادہ شہرت ان کی قصیدہ گوئی کی وجہ کر ہے اور اس فن کو انہوں نے اس بلندی تک لے گئے جہاں سے آگے آج تک کوئی دوسرا نہ لے جا سکا لہٰذا سوداؔ کے قصیدہ کی شہرت کمال کو پہنچتی ہے اور ہجو بھی کافی مقبول رہا ہے لوگ ان کی شان کے خلاف بات کرنے میں خوف کھاتے تھے کہ کہیں مرزا سوداؔ کوئی ہجو نہ کہہ دیں۔ ان کے بعد۔

میر محمد تقی میرؔ اردو شاعری اور زبان اردو کے سب سے زیادہ بلند مرتبت شاعر ہیں ان کی آہستہ روی نرمی اور ملائمیت کے ساتھ عادات و اطوار نہایت سنجیدہ اور متین ہر وقت محویت کے عالم میں رہتے۔ تھے میر کا یہ خاصہ اردو کے شعراء کا چلن بن گیا یعنی میرؔ کے انداز میں اپنی عادت بنانا اور کلام کہنا باعث فخر و امتیاز سمجھتے۔ میر جہاں دیدہ تجربہ کار حالات کا مارہ مصیبتوں سے چور ایک ایسا شاعر ہے۔ جس کا دل دنیا کی رنگینیوں سے اکتا گیا ہے میرؔ قصیدہ، مثنوی، مرثیہ نثر میں تذکرہ نکات اشعراء ہے لیکن ان کی شہرت غزلوں کی وجہ کر ہے انکی مثنوی بھی کمال کی ہے نئے راہ کی طلب کا احساس ہوتا ہے نکات الشعراء بہت ہی اہم کتاب ہے جو قدیم اور جدید شاعروں کی تاریخ مرتب کرنے میں سنگ میل کا کام کرتی ہے۔

جہاں سے دیکھئے اک شعر شور انگیز نکلے ہے
قیامت کا سا ہنگامہ ہے ہر جا میرے دیوان میں

سرہانے میرؔ کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

خواجہ میر دردؔ اس دور کے باکمال صوفی بزرگ شاعر ہیں۔ ان کی صوفیانہ رنگ نے غزل کو ایک نئی راہ اور جہت عطا کی۔ ان کے کلام میں نفاست و سادگی کے ساتھ ساتھ خیالات میں بلندی اور جذبات میں جوش اور عارفانہ کلام میں جاذبیت ہے۔

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

میر غلام حسن میر حسنؔ کے نام سے مشہور اردو ادب کے چار مینار میں ایک مینار ان کے نام ہے۔ انہوں نے گویا! کہ کبھی صنف سخن پہ طبع آزمائی کی ہے لیکن جس نے ان کی شہرت کو دوام بخشی وہ ہے مثنوی سحرالبیان کی شہرت اور مقبولیت اس قدر ہے کہ اردو ادب میں جب بھی مثنوی کا ذکر ہوتا ہے تو سب سے پہلے میر حسن کی مثنوی سحرالبیان کی تابانی نمایاں ہوجاتی ہے۔

سید میر محمد سوزؔ غزل کے مرومیداں شاعر ہیں زبان میں شیرینی لطافت اور تشبیہات واستعارات میں سادگی ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس دور کے خاتمہ تک یقینؔ اور بیدارؔ کا بھی ذکر آتا ہے۔

الغرض کہ شمالی ہند میں اردو ادب اٹھارویں صدی کے خاتمہ تک نثر کے مقابلے نظم نے کافی عروج حاصل کی اور تمام ابتدائی عیوب سے پاک وصاف ہوکر ایک لطیف اور شگفتہ زبان سامنے آئی اور اس عہد نے چار مینار اردو کو جنم دیا اسکا متبادل دوسرا کوئی نہ ہوسکا میر تقی میرؔ، مرزا رفیع سوداؔ، میر حسنؔ اور خواجہ میر دردؔ وغیرہ شعراء نے اردو شاعری کو بامِ عروج پر لا کر کھڑا کر دیا۔

اردو نثر آغاز سے 1857ء تک

اردو نثر کی ابتداء صوفیائے کرام اور بزرگان دین کے ملفوظات اور چند فقروں سے ہوتی ہے۔ جیسا کہ تاریخ ادبیات کے محقق کی تصانیف سے پتہ چلتا ہے کہ شیخ فرید الدین گنج شکر کا ایک لفظ ''بھیا'' اور خواجہ بندہ نواز سید محمد گیسودراز کے چند جملے معراج العاشقین میں لکھتے ہیں۔''ایک بادشاہ کی تعظیم ایک امیر کوں بڑی کرتا ہے تو اول جا بجا آرائش کرتا ہے'۔

اردو نثر کے ابتداء میں شمال سے زیادہ دکن میں تصنیف و تالیف کا کام ہوا ھے کیونکہ وہیں سے ابتدائی نمونے دستیاب ہیں۔ شمس العشاق نظم اور نثر دونوں میں لکھتے تھے۔ نثر میں جل ترنگ، گل باس اور شرح مرغوب القلوب میں تصوف کے مسائل بیان ہوئے ہیں شاہ میرانجی شمس العشاق بیجاپوری نے اردو میں مسائل تصوف پر کتابیں لکھ کر اردو کے ابتدائی دور کا آغاز کرتے ہیں یہی آگے چل کر اردو نثر کے لئے راستے ہموار کرتے ہیں۔ شاہ برہان الدین جانم کی تصنیف ''کلمتہ الحقائق'' اور احکام الصلوٰۃ میں مولانا عبداللہ فرماتے ہیں کہ 'بات کرتے سوں نماز جاتا ہے''۔

متذکرہ کتابوں جملوں اور احوال صوفیوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اردو نثر کی ابتداء میں بزرگانِ دین نے سب سے زیادہ اہم رول ادا کیا ہے اس کے بعد ہی ادیبوں نے اس کی مقبولیت عام فہمی کے سبب زبان اردو میں تصنیف و تالیف کا کام کرنے لگے۔ اس میں سب سے پہلے ملاّ وجہی 1625ء میں شہرہ آفاق تخلیق ''سب رس'' کیا۔ اس میں حسن و عشق کی کشمکش اور عشق و دل کے معرکے کو قصے کی صورت میں پیش کیا ہے طرز بیان بھی دل کو لو بھانے والا ہے اور روانی و سلاست بھی قائم رہتی ہے۔ مصنف نے ایک عام اور عالمگیر حقیقت کو مجاز کے پیرائے میں بیان کر اصل کو قصے کی شکل میں سمجھانے کی دلکش اور پر جاذب کوشش ہے اس کتاب کی شہرت نے ہی دوسرے مصنفوں کو اردو نثر کی طرف راغب کیا حال آنکہ اردو نظم دکن میں جس تیزی اور سرعت کے ساتھ ترقی کی۔ اس کی بنسبت نثر کی اتنی تیزی سے ترقی نہیں کی اوّل تو صوفیوں کے ملفوظات اور فارسی کے ترجمے کے ذریعہ اردو نثر کی طرف راغب ہوئے مثلاً ''میراں یعقوب نے شمائل الاّ تقیا اور دلائل الاّ تقیا کا ترجمہ دکنی اردو میں کیا لیکن اس کی زبان بہت ہی صاف اور سادہ ہے سید شاہ محمد قادری رائے پوری کی طوطی نامہ اور مذہبی رسالے لکھے اور سید شاہ میر کی کتاب 'اسرار

التوحید'توحید سے متعلق کتاب لکھ کر اردو نثر کی کڑی کو آگے بڑھایا۔

اردو نثر کے ابتدائی نشو نما میں شمال کی بنسبت جنوب یعنی دکن کو زیادہ فوقیت حاصل ھے۔ حلانکہ اس میں زیادہ تر کتابیں مذہبی تھیں پھر بھی ابتدائی کوشش میں اسکا بھی اہم کردار رہا ہے۔ اس سے ایک بات صاف ہو جاتی ہے کہ اس دور تک عوام النساس کی زبان اردو تھی۔ یہی وجہ ھے کہ صوفیوں نے اسلامی تعلیمات عوام تک پہنچانے کے لئے ان ہی کی زبان کا انتخاب کیا۔ جسے آج اردو کے نام سے جانا جاتا ہے۔

شمالی ہند میں اردو کے ابتدائی نمونہ' کربل کتھا' یا دہ مجلس 1732ء میں شاہ فضل اللہ فضلی نے روضۃ الشہداء کا اردو ترجمہ کیا تھا۔ یہ بھی مذہبی ہے واقعات کربلا کو 'کربل کتھا' کے نام سے موسوم کر مقامی زبان کی آمیزش کا پتہ ملتا ہے۔ اس کے بعد شمال پھر خاموش نظر آتا ہے ایک مدت کے بعد سودا نے اپنے دیوان مرثیہ کا دیباچہ اردو میں لکھ کر اس تعطل کو توڑا۔ پھر کیا تھا اہل قلم نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ابتداء میں اردو عاری، مقفّی و مسجع لکھا کرتے تھے اور اپنے علم دانی کا مظاہرہ بھی ہوا کرتا تھا یایوں کہا جائے کہ اردو نثر کو اب تک کسی قابل اہل قلم و نظر کی تلاش تھی جو اس کی ابتدائی خامیوں کو تراش خراش کر چکائے۔ یہ کام فورٹ ولیم کالج نے کیا۔

1801ء میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ کا قیام عمل میں آیا۔ یہاں تصنیف و تالیف کے علاوہ خاص کام ترجمہ کا تھا۔ جان گلکرائسٹ اس کے مہتمم اعلیٰ تھے۔ یہیں سے اردو نثر کو ایک سمت ملی ایک مرتبہ اور مقام حاصل ہوا۔ یہاں تک کہ دربار شاہی میں اس کی رسائی ہوئی اور اسے سرکار کی عدالتی زبان بننے کا شرف حاصل ہوا۔ فورٹ ولیم کالج کے روح رواں نشار مرزا لطف علی لطف، میر امّن دہلوی، سید حیدر بخش حیدری، نہال چند لاہوری، شیر علی افسوس، بنی نرائن اور بہادر علی حسینی وغیرہ کی کوششوں نے اردو نثر کی ترقی کی راہ ہموار کی۔ ان لوگوں نے عام فہم اور دلچسپ زبان استعمال کیا مقفّی و مجمع اور مرسع عبارت کی جگہ سادہ صاف اور سہل زبان استعمال کر لوگوں کی دلچسپی بڑھائی۔

میر امّن دہلوی نے قصہ چہار درویش کا اردو ترجمہ "باغ و بہار" کے نام سے کیا اور اس خوبی سے کیا کہ عام و خواص دونوں سے قبول عام کی سند حاصل کی۔ لوگوں کے جذبات حفظ مراتب کے ساتھ اس طریقہ سے ادا کیا کہ عورت و مرد، آقا و نوکر رو برو محو گفتگو ہوں۔ للو لال جی دراصل ہندی کے مصنف ہیں لیکن اردو میں بھی ان کی ایک کتاب "سنگھاسن بتیسی" نام سے ہے۔ مرزا علی لطف نے سب سے بڑا اور اہم کام جان گل کرائسٹ کی فرمائش پر تذکرہ "گلشنِ ہند" مرتب کیا۔ سید حیدر بخش حیدری نے طوطا کہانی، قصہ لیلیٰ مجنوں' گلزار دانش' آرائش محفل اور گل مغفرت ہے۔ ان میں سب سے زیادہ شہرت ملی

آرائش محفل کو یہ قصہ حاتم طائی پر ہے۔ ایک اور کتاب امیر خسرو کی مثنوی کا اردو ترجمہ لیلیٰ مجنوں بھی کافی مقبول ہوئی۔ میر شیر علی افسوسؔ انہوں نے کئی کتابیں لکھیں لیکن سب سے اہم کتاب' آرائش محفل ' ہے جو جغرافیہ اور تاریخ پر اردو کی پہلی کتاب ہے۔

غرضکہ فورٹ ولیم کالج نے اردو نثر کے فروغ میں نہایت اہم اور قابل رشک کام کیا ھے۔ یہاں سے اردو کو ایک صحیح سمت اور قدر و منزلت کی راہ ہموار ہوئی۔ جو کام فورٹ ولیم کالج میں ہو رہا تھا اس سے ہٹ کر دہلی وغیرہ شہروں میں بھی اردو نثر میں تصنیف و تالیف کا کام ہو رہا تھا لیکن یہاں کی زبان میں سادگی اور عام فہم الفاظ کی کمی تھی۔ مرزا رجب علی بیگ سرورؔ کا سب سے بڑا کارنامہ 'فسانہ عجائب' ہے۔ یہ ایک عشقیہ فسانہ ہے جو اس دور میں بہت ہی مقبول ہوا اور آج بھی اس کی ادبی حیثیت مسلم ہے۔ اس کی عبارت نہایت ہی پر تکلف اور مقفیٰ و مسجع سے پر ہر جگہ رنگینی و دلکشی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مسرورؔ کی ویسے تو کئی تصانیف و ترجمہ ہیں لیکن مرزا صاحب جس سے ادب میں جانے پہچانے جاتے ہیں وہ ہے "فسانہ عجائب" مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ اردو ادب کا ایک ایسا مرد آہن ہے جس کا نام سنتے ہی زبان پہ غالبؔ کا غلبہ اور لقنت طاری ہو جاتا ہے کیونکہ جس طرح ان کی شاعری اردو شاعری کی آبرو ہے اسی طرح ان کی نثر نگاری بھی ایک بلند مرتبہ کی حامل ہے ان کے خطوط نے تو اردو خط نویسی میں انقلاب پیدا کر دیا اور جسے دیکھ کر کوئی غالبؔ کے رنگ میں خط لکھنے کی کوشش کرنے لگے۔ ان کے خطوط میں لکھنے والا اور پڑھنے والا دونوں باہم ہم کلام نظر آتا ہے یعنی ڈرامائی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کی نثر نگاری میں سادگی، صفائی اور روانی ہے۔

1857ء تک اردو نثر کی ترقی میں غلام امام شہیدؔ، غلام غوث بے خبرؔ اور آخر میں سر سید احمد خاں کی ادبی خدمات کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے کیونکہ سر سید کی نثری خدمات کا آغاز تو قبل بغاوت ہند سے ہی شروع ہو چکا تھا اور غالبؔ کی صحبت نے کافی متاثر کیا تھا۔ اردو نثر کے آغاز سے 1857ء کے جنگ آزادی کی پہلی لڑائی تک دو موڑ ایسے آئے ہیں جہاں سے اردو نثر نے اپنا رخ موڑ کر آج کی زبان تک پہنچی ہے۔ پہلا موڑ ڈاکٹر جان گل کرائسٹ کی سرپرستی میں چلنے والا ادارہ فورٹ ولیم کالج کا ہے جہاں سے اردو نثر اپنا صحیح اور مناسب راہ منتخب کر ترقی کی راہ پر گامزن ہوئی۔ دوسرا موڑ سر سید کی تحریک ہے حالانکہ ان کے اور ان کے دوستوں کا ادبی سرمایہ 1857ء کے بعد منظر عام پر آیا لیکن سر سید کے مزاج کا خمیر تو پہلے سے ہی اس جانب متوجہ ہو چکی تھی سوسائٹی اور اداروں کا قیام اسی راہ کی کڑی ہے۔ غرضکہ 1857ء تک اردو نثر ترقی کے تمام منازل طے کر اپنے شباب کو پہنچ چکی تھی۔

☆☆☆

اردو شعر و ادب

انیسویں صدی کے نصف اوّل تک

اردوشعروادب انیسویں صدی کے نصف اوّل تک صنف شاعری کے تمام ادبی گوشوں پرطبع آزمائی ہوچکی تھی اور بہتوں نے تو اپنے کمال فن کا مظاہرہ کر اس فن کے نام سے منسوب ہو چکے تھے۔

اردوشعروادب۔زبان اردو کے ابتداء ہی میں امیر خسرو جیسا با کمال شاعرمل گیا یا یوں کہیں کہ امیر خسرو نے ذائقہ تبدیل زبان کی خاطر جن مقامی زبان کو فارسی کلام سے ملا کر اپنی غزل کہی وہ آگے چل کر ایک مکمل زبان کی شکل اختیار کر تمام رعنائی کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا ہے اور شعروادب کی دنیا میں ایک اہم اور بلند مرتبت مقام حاصل کر چکی ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو شاعری کی ابتداء امیر خسرو نے کی لیکن اس کی پرورش جنوبی ہند یعنی دکن میں ہوئی اس کے تاریخی وجوہات جو بھی رہے ہوں اردو شعر ادب اپنی تمام ابتدائی کمیوں اور خامیوں کو دور کرتی رہی اور دکن کے فارسی گو شاعروں نے اسے اپنے دامن تربیت میں خوب سینچا۔ شاہ میراجی، جانمؔ، وجدیؔ، محمد قلی قطب شاہ، قطبؔ شاہ عبداللہ قطب شاہ، ابن نشاطی، غواصیؔ، ملا قطبی، مرزا ہجری، شیخ شجاع الدین نوری ہاشم اور ولیؔ وغیرہ شاعروں نے زبان اردو کی آبیاری میں خوب بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور شاعری کے مختلف صنف شاعری پرطبع آزمائی کر اپنے جوہر فن کا مظاہرہ کیا ان میں غزل قصیدہ مثنوی اور مرثیہ خصوصی طور پر توجہ کا مرکز رہا۔ غزل پر تقریباً سبھی شاعروں نے زور آزمائی کی ہے قصیدہ کو کم ہی لوگوں نے اپنایا مگر مثنویاں کافی تعداد میں لکھی گئیں کیوں کہ وہ جو دور تھا قصے کہانیوں کا زمانہ تھا عشق وعاشقی کی شگفتہ بیانی سے زیادہ محظوظ ہوتے تھے لہٰذا اس دور میں مثنویوں کو زیادہ رواج ہوا اس میں خالص عشقیہ مثنوی کے ساتھ عارفانہ مثنوی بھی لکھی گئی کیوں کہ وہ وقت کی ضرورت تھی تقریباً سبھی شاعر معارف صوفی اور ماحول کے موافق تھے مرثیہ تو ایک مذہبی عقیدہ کے تحت لکھا گیا لیکن اردو کے ابتدائی دور دکن میں ولیؔ تک جس صنف ادب کو سب سے زیادہ شہرت اور مقبولیت ملی وہ ہے غزل اور غزل نے ہی اردو کی پہچان بنائی اور یہ سلسلہ آج بھی قائم ہے حالانکہ فن شاعری کے میدان میں غزل سب سے زیادہ سخت جان اور مشق مسلسل ہے پھر بھی جب کوئی شاعری شروع کرتا ہے تو پہلے غزل ہی سے اپنی شاعری کی ابتدا کرتا ہے اس کے بعد ہی کسی دوسری صنف شاعری کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔

اردو شاعری وؔلی کے ہمراہ دوبارہ جب دلّی آئی تو اپنی چمک دمک سے دلّی والوں کا دل موہ لیا اور ایک ایسا شمع باندھا کہ ہر گلی کوچے میں لوگ غزل پڑھتے سنے گئے یہاں کے فارسی گو شاعروں نے اردو کو اپنے دامن تربیت میں لیکر پروان چڑھائی ان میں شاہ مبارک آبرؔو، محمد شاکر ناجؔی شیخ مضمون، محمد احسن، یک رنگ، حاتمؔ اور فغاں وغیرہ خصوصاً حاتم نے زبان کو پاک وصاف کرنے کی مہم چلائی جو زیادہ کارگر ثابت نہیں ہوئی۔ لیکن اتنا ہوا کہ زبان و بیان میں اور انداز کلام میں صفائی آنے لگی۔ ان کی کوششوں کا ہی نتیجہ تھا کہ مرزا مظہر جان جاؔناں نے زبان کی صفائی میں مقامی الفاظ کو متروک کرنے لگے اور فارسی عربی الفاظ کو داخل کرنے لگے اس سے اردو شعر و ادب فارسی ادب و عربی ادب سے قریب اور متاثر ہونے لگی۔ اردو کی بنیاد جن مقامی زبانوں کے تعاون اور ماحول میں ہوئی تھی اس میں فارسیت کے دخل نے اردو کی مقامیت کو بری طرح مجروح کیا۔ اس زمین پر مرزا محمد رفیع سوؔدا نے قصیدہ کی وہ عظیم دیوار کھڑی کردی کہ آج بھی ناقابل عبور بن کر رہ گئی ہے۔ حالانکہ قصیدہ کی عظمت تو بلند ہوئی لیکن غزل کی عظمت و شہرت اپنی جگہ قائم رہی اور میر تقی میر خواجہ میر درؔد، میر حسنؔ کی مثنوی سحر البیان کی شہرت اور بلندیوں نے سابقہ تمام مثنویوں کو اپنے پیچھے چھوڑ دیا اور میر سوؔز کی غزلوں نے غزل کی مرکزیت کو قائم رکھا۔ اس کے بعد کے دور میں جرأؔت، انشاؔء، مصحفؔی اور نظیر اکبر آبادی نے اپنے کمال فن کا خوب بڑھ چڑھ کر مظاہرہ کیا یہاں بھی غزل کی مرکزیت قائم رہی لیکن نظیر کی نظم نگاری نے اردو شعر و ادب کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے کے لئے مجبور کیا یعنی نظیر اکبر آبادی نے موضوع کی مناسبت سے عنوان کے تحت نظم لکھنے لگے ان کی زبان اور انداز بیان عام فہم اور زبان میں ہندوستانیت کا رنگ بھرا ہوا ہے۔ ان کے اشعار میں مقامی رنگ نمایاں ہیں جو اردو شعر و ادب کے لئے ایک نئی چیز اور ایک نیا تجربہ ہے ان کے بعد کے شعراء ناسؔخ، آتشؔ، نسیم، میر ضمیر، میر خلیقؔ، انیسؔ دبیرؔ، نصیرؔ، ذوقؔ، غالبؔ، نسیم، آتشؔ اور مومن تک شاعروں کی ایک لمبی فہرست ہے ان لوگوں نے اردو شاعری میں اپنی الگ پہچان بنائی اپنا مرتبہ بلند کیا ساتھ ہی ساتھ فن شاعری کو عروج بھی حاصل ہوتی رہی۔ انیسویں صدی کے نصف آخر تک غزل اپنی تمام تر تابانیوں کے ساتھ آسمان سخن پر رخشندہ تھی وہیں مرثیہ گوئی کو بھی کافی عروج حاصل ہوا خصوصاً میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کی معرکہ آرائیوں نے مرثیہ کو عقیدہ کا ایک اہم جز بنا دیے اور کافی ترقی کی۔

عرض کہ اردو شعر و ادب انسویسویں صدی کے نصف تک قصیدہ مثنوی، مرثیہ، نظم نگاری اور غزل سبھی میں صفائی اور چمک پیدا ہوئی یا یوں کہیں کے کلاسکی ادب کی تاریخ میں یہ عہد ذرّیں ہے کیونکہ شعر و ادب کا کوئی بھی۔ فن پارہ اس سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ ہمیں اس بات کا اقرار کرنے سے گریز نہیں کہ

اردو زبان شعروادب نے جتنی ترقی انیسویں صدی کے نصف تک کی آج بھی اس سے آگے نہیں بڑھ سکی ہے۔ہاں: اتنا ضرور ہوا ہے کہ نئی تحریک اور فکر کو جگہ ملی ہے لیکن جہاں تک شاعری کا سوال ہے مرثیہ میں انیس ودبیر، مثنوی میں میرحسن، میرتقی میر، راسخ عظیم آبادی، جوش عظیم آبادی، قصیدہ میں ذوق وسودا، نظم میں نظیر آبادی اور غزل میں خواجہ میر درد، میرتقی میر، غالب، آتش، مومن، داغ اور شاد عظیم آبادی وغیرہ نے اردو شاعری کو جن بلندیوں پر لا کھڑا کیا تھا آج تک اسی بلندی پر قائم ہے۔

کہا میں نے کتنا ہے گل شبات　　کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے　　دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

میرتقی میر

غزل خواجہ ہے مطلب کو پیچ اے آتش　　نالہ بے اثر مرغ نوا سج نہیں

بہار لالہ وگل سے لگی ہے آگ گلشن میں　　گریباں پھاڑ کر چل بیٹھے صحرا کے دامن میں

شب فراق میں اکدم نہیں قرار آیا　　خدا گواہ ہے شاہد ہے آرزو تیری

آتش

آہ کو چاہئے اک عمر اثر ہونے تک　　کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

قید حیات بند وغم اصل میں دونوں ایک ہیں۔　　موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ　　دیکھیں کیا گذرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

غالب

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا　　جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

وہ جو ہم میں تم قرار تھا　　تمہیں یا دہو کہ نہ یاد ہو

وہی یعنی وعدہ نباہ کا　　تمہیں یا دہو کہ نہ یادہو

مومن

مذکورہ شاعروں کے کلام کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ غزل میں مومن تنگ نائے غزل کے دور سے گذر کر ایک وسیع وعریض میدان حاصل کرلیا ہے جہاں موضوع ومواد کے ساتھ ساتھ زبان بیان کی ندرت اور سادگی صلاست وروانی نے دل کو موہ لیا۔یہی وجہ ہے کہ انگریزی سرکار نے 1835ء سے اردو کو سرکاری زبان قرار دیکر اس کی ترقی اور مقبولیت کا احترام کرتے ہوئے اس کی افادیت کو تسلیم کیا تھا۔اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انسویں صدی کے نصف اوّل تک اردو زبان خصوصاً شاعری اپنی کامیابی کے تمام منازل طے کرلی تھی۔

☆☆☆

1857ء کے بعد اردو زبان و ادب

پہلی جنگ آزادی کی ناکامی نے دربار مغلیہ کے ساتھ ساتھ اردو کے دوسرے مراکز لکھنؤ حیدآباد دکن، عظیم آباد بہار کلکتہ وغیرہ کو بھی متاثر کیا اردو زبان و ادب دربار شاہی اُمراء وزُوسا کی محفلوں سے دھیرے دھیرے ہٹنے لگی اور ادیب وشاعر انفرادی طور پر یا کسی ادارہ سے منسلک ہو کر اپنے رزق کی تسکین میں لگ گئے۔

1857ء کے بعد اردو زبان وادب میں انقلاب آیا لوگوں کے سوچنے سمجھنے اور معاشرہ کو بیدار کرنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی اس ضمن میں سرسید احمد خاں اور ان کے رفقاؤں کی خدمات قابل احترام ہے جسے علی گڑھ تحریک سے منسوب کیا جاتا ہے اس تحریک نے اردو زبان کی آبیاری میں کئی ایسے تاریخ ساز کام کئے ہیں جن کے وجود سے اردو ادب کا سرمایہ مال و مال ہوگیا۔ اس دور کی سب سے بڑی خوبی حقیقت نگاری رہی ہے نثر و نظم دونوں جہتوں میں فکر کی بلندی معاشرہ کو بدحالی سے نکالنے کی کوشش اور ادب کو زندگی کے قریب تر لانے کی کوشش کی جانے لگی۔ سرسید احمد خاں نے رسالہ تہذیب الخلاق کے ذریعہ لوگوں میں اصلاح لانے کی کوشش کرنے لگے ایسے ایسے کارآمد مضامین انہوں نے خود لکھے اور ان کے دوستوں نے بھی لکھے اور معاشرہ کی بدحالی سدھارنے میں لگ گئے۔

علی گڑھ تحریک سے اردو زبان ادب میں کئی صنفی اور ہیئتی اضافہ ہوا۔ مقصدی مضامین لکھنے کا چلن شروع ہوا تو ڈپٹی نذیر احمد نے اردو میں تعزیرات ہند، مراۃ العروس بنات النعش، توبتہ النصوح ابن الوقت رویائے صادقہ۔ لکھ کر قانون اور ناول نگاری کی ابتداء کی ناول نگاری سے جہاں نذیر احمد نے اردو ادب میں بحیثیت فن کے اصافہ کیا وہیں غالب کی شاعری اور ان کے خطوط نے تہلکا مچادیا۔ غالبؔ اردو زبان و ادب کا وہ قد آور شخصیت جس کے نام سے اردو اور اردو کے نام سے غالبؔ بین القوامی سطح پر پہچانے جاتے ہیں۔ تحقیق وتنقید کے فن کا آغاز کرتے ہوئے محمد حسین آزاد نے ''آب حیات'' میں اردو کی پیدائش کے نظریہ کو تقویت دی وہیں اردو کے سابقہ تمام شاعروں کے کلام اور حالات زندگی لکھ کر صحیح معنوں میں انہیں آب حیات پلادیا ہے۔ ذکاءاللہ، سید علی بلگرامی شبلی نعمانی اور الطاف حسین حالی نے تو فن تنقید نگاری کو ایک جہت عطا کیا شبلی نعمانی نے میر انیسؔ و دبیرؔ کا تقابلی تنقید لکھ کر ایک نئے باب کا اضافہ کیا وہیں حالیؔ نے مسدسؔ حالی لکھ کر نظیر اکبر آبادی کی نظم نگاری کی روایت کو درست ٹھہراتے ہوئے نظم نگاری پر بہت

زیادہ زور دیا اور اسی کتاب کے دیباچہ میں مقدمہ شعر شاعری لکھ کر شاعری کے اصول مرتب کئے۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار منشی سجاد حسین عبدالحلیم شرر، مرزا ہادی رسوا راسدالخیری وغیرہ علماؤں نے نثر نگاری میں داستان سے ناول تک کا سفر اس حسن خوبی کے ساتھ طئے کیا کہ اردو زبان وادب آج بھی ممنون و مشکور ہے منشی پریم چند نے افسانہ کو اردو ادب سے روشناس کرایا اور اس فن میں بلندی کی انتہا تک پہنچ گئے انہوں نے نہ صرف افسانہ بلکہ ناول کو بھی وہ معراج عطا کیا جہاں سے آگے آج بھی اردو نہیں بڑھ سکی ہے۔ اس سفر کے شرکار میں سدرسن۔ نیاز فتح پوری، سجاد حیدر یلدرم، خواجہ حسن نظامی، ابوالکلام آزاد، رشید احمد صدیقی، سید سلمان ندوی شاد عظیم آبادی، عبدالحق اور محی الدین قادری زور وغیرہ نے نثری ادب کے خزانہ کو بھر دیا۔

شعر وشاعری میں 1857ء کے بعد غالب اور مومن کا خاتمہ ہو جاتا ہے لیکن ان کے اثرات پوری طرح باقی رہ جاتے ہیں ان پر رونق محفل جمانے والے شعراء میں داغ دہلوی، امیر مینائی شاد عظیم آبادی، حالی، اسمٰعیل، اکبر الہ آبادی، چکبست اور اقبال نے اردو شاعری کو وہ کمال دیا کہ پوری شاعری اقبال مند ہوگئی اصغر گونڈوی، جگر مرادآبادی، فانی بدایونی اور جوش ملی آبادی تک آتے آتے اردو زبان ترقی پسند تحریک کی سمولیت ہوتی ہے اس کے بانی سجاد ظہیر تھے۔

ترقی پسند تحریک نے اردو زبان و ادب کے ہر گوشے کو پوری طرح متاثر کیا اور لوگوں کے انداز فکر میں ایک زبردست انقلاب پیدا کر دیا اور جوش، فیض، جمیل مظہری، پرویز شاید وغیرہ شاعروں کی ایک لمبی فہرست ہے جنہوں نے شاعری کے نئے روپ میں اپنے فکر و تجربہ کو پیرو کر زبان اردو کی عزت و شان میں اضافہ کیا۔

الغرض 1857ء کے بعد اردو زبان وادب نے کافی ترقی کی اور بے شمار ادیب وشاعر نے علی گڑھ تحریک سے لیکر ترقی پسند تحریک تک اور اس کے بعد اردو جدید تر جدیدیت تحریکوں سے اردو زبان و ادب میں اضافہ کیا 1947ء کے بعد محبان وطن اور مجاہدین اردو نے اسے پھر سے سنبھالنے کی کوشش میں لگ گئے ہیں جگہ جگہ سرکاری عنایات سے اردو اکادمی کا قیام خوش آئند کل کی علامت ہے۔

☆☆☆

بیسویں صدی میں اردو ادب کا ارتقاء 1947ء تک

بسویں صدی کی شرعات نہایت ہی تابناک اور ہمت افزا ہے۔اردو ادب کے لئے اس دور میں محمد حسین آزاد الطاف حسین حالیؔ اسمٰعیل مرٹھی اکبرالہ آبادی سرورؔ چکبست علامہ اقبالؔ جسے عظیم الشان فنکاروں کا ساتھ ملا۔ان لوگوں نے اردو شاعری کو ایک نیا مزاج نئی جہت عطا کی حالیؔ نے نیچرل شاعری کے نغمے بلند کئے غزل کے علاوہ مسدس مثنوی اور رباعی کو خاصی اہمیت حاصل ہوئی اردو کا عظیم کارنامہ ''مدوجزر اسلام'' حالیؔ نے مسدس کے فورم میں لکھا،شکوہ جواب شکوہ اقبالؔ نے مسدس کے فورم میں لکھا چکبستؔ کی تمام قابل قدر نظمیں مسدس کے فارم میں لکھی گئیں۔حالیؔ ،آزادؔ اور اقبالؔ کی چھوٹی چھوٹی نظمیں مثنوی کے فارم میں لکھی گئیں ہیں اور اکبرالہ آبادی کے سرمایہ رباعی قطعہ اور متفرق اشعار طنز مزاح کے نشتر میں ڈوبا ہوا ہے کیونکہ یہ زمانہ بیداری کا تھا سارا ہندوستان انگڑائی لے کر کروٹ بدلنے کے لئے بے تاب ہو رہا تھا جنگ آزادی شباب پر تھی اس لئے بسویں صدی کے ابتداء ہی سے فلسفہ اخلاق، انسانیت، حب وطنی، معاشرہ میں سدھار، سیاست میں جوش اتحاد اور رواداری کے گیت الاپے جارہے تھے۔مغربیت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی جدو جہد ہو رہی تھی۔ان تمام رجحانات سے اردو زبان و ادب متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکی اور اردو داں طبقہ نے خوب بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور لسانی اعتبار سے اردو کو تمام مجاہدین آزاد نے متفقہ زبان قرار پائی اور اس کے ذریعہ نعرہ انقلاب بلند ہوا 1935ء میں ترقی پسند تحریک نے زور پکڑا تو ہندوستان کی سبھی زبانوں میں ادبی سرگرمیاں تیز ہو گئیں اور انکا نصب العین بدل کر رہ گیا ایسے موقع پر ملے جلے اثرات مرتب ہوئے اصغرؔ گونڈوی، جگر مرادآبادی، فانی بدایونی جوش ملیح آبادی وغیرہ نے کلاسکی ادب کو فروغ دیا تو جوشؔ نے اپنے زور بیان سے ہندوستانیوں کے دل کو مضطرب اور متزلزل کردیا۔آزادی کے جوش جنون کو ہوا دیکر دہکا دیا۔

ترقی پسند مصنفین کی کوششوں نے اردو زبان و ادب کو ایک نئی راہ دکھائی ایک نیا سوچ اور فکر عطا کیا علامہ اقبالؔ اور پریم چند جیسا عظیم فنکار بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا اور اقبالؔ نے کہا۔

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلا دو

عرض کہ اردو زبان وادب نے بسویں صدی کے ابتداء ہی سے اپنی انفرادیت قائم کر دی تھی ناول، افسانہ میں پریم چند، سدرشن، نیاز فتح پوری سجاد حیدر یلدرم، خواجہ حسن نظامی، رشید احمد صدیقی، مرزا فرحت اللہ بیگ، سید سلیمان ندوی، عبدالماجد، دریا آبادی، مولوی عبدالحق، محی الدین زور کلیم الدین احمد قاضی عبدالودود، اختر شیرانی، حفیظ جالندھری، فیض احمد فیض، محمد راشد، احسان دانش، کرشن چندر، اختر اورینوی وغیرہ انشاپرداز، نقادمحقق اور شاعروں نے اردو زبان وادب کو نئے نئے فکر اور رجحانات سے روشناس کرایا اور اپنے گراں قدر تخلیقات سے اردو کے سرمایہ کو جلا بخشی 1947ء تک اردو زبان وادب ہر جہت سے مکمل ہو کر خود اعتماد ہو چکی تھی اس ضمین میں سید سلمان ندوی لکھتے ہیں ''مطبوعہ اردو کتابوں کی اہمیت بھی یہاں (انڈیا آفسٹ لائبریری لندن میں) میری نگاہ میں کچھ کم نظر نہ آئی اور تھوڑی دیر کے لئے مجھے مغرور ہونا پڑا کہ اے اللہ ہماری زبان بھی اس قدر ترقی یافتہ ہے کہ تین سو صفحہ میں اس کی فہرست تمام ہوئی ہے۔'' اس عہد میں متعدد انجمنیں اور ادارے قائم تھیں جو دن رات ادب اردو کی ترقی میں سرگرم و کوشاں رہی ہیں۔

۱۔ انجمنیں ترقی اردو، اورنگ آبادی ۲۔ دارالتراجم عثمانیہ یونیوسیٹی

۳۔ شبلی اکیڈمی یعنی دارالمصنفین

۴۔ ہندوستانی اکیڈمی آلہ آباد کے ذریعہ علمی وادبی اور ملک کے معزز حضرات کی تقاریر شائع ہوتی تھیں اس دور میں تراجم بھی بہت ہوئے انگریزی یونانی، سنسکرت فارسی وغیرہ زبان کے مشہور مصنفین کے کارناموں کو اردو میں ترجمہ کیا گیا سنسکرت اور بنگالی کے ڈرامے بھی اردو میں ترجمہ کئے گئے اس کے علاوہ ریاضی، جغرافیہ معاشیات، سیاسیات، اقتصادیات، تاریخ، سائنس اور مذہب پر بے شمار کتابیں تالف و ترجمہ کے ذریعہ اردو ادب میں داخل ہوئی۔

ادب کا خاصہ رہا ہے کہ وہ اپنے ماحول اور سماج کی ترجمانی کرے ان کے خیالات کی ترجمانی بڑی صداقت سے اپنا فرض پورا کیا۔ فرنگیوں کے پنجہ غضب سے نجات دلانے کا احساس ہوا تو بڑی قربانیاں دیکر مردانہ وار قوم و ملک کی تعمیر نو میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ آزادی کی تحریک کی ابتداء سے انتہا تک سیاسی رہنماؤں کے ہمدوش چلتی رہی۔ کوئی جلسہ ایسا نہ ہوتا جہاں اردو کی نظمیں دلوں کو گرمانے کے لئے پڑھی جاتی تھیں جیل سے بھی شعراء اپنا پیام بھیجتے رہے چکّی کی مشقت کے ساتھ مشق سخن بھی جاری رہی غالباً ہندستان کے کسی زبان نے قوم و ملک کا اس معرکہ میں اتنا ساتھ دیا ہو جتنا اردو نے دیا ہے۔ یہ اپنی پوری رفتار سے آگے بڑھتی رہی یہاں تک کہ 1947ء میں ہندوستان کو آزادی نصیب ہوئی۔

ہندستانیوں کو اس منزل مقصود تک پہنچنے میں اردو زبان وادب کا بہت ہی اہم کردار ہے۔ آزادی کے جیالے نوجوانوں کو عزم مصمم عطا کرنے کے لئے اردو میں ایسے بے شمار ادبی سرمایہ موجود ہیں جس کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ ملک کی آزادی میں اس نے اہم رول نبھایا ہے۔

اس طرح 1947ء تک اردو زبان ادب ترقی کے تمام منازل طئے کرتی ہوئی مختلف اصناف ادب کو بڑھاتی ہوئی اس مقام پر پہنچ گئی تھی جہاں سے اسے ملک کی رہنمائی کرنی تھی۔ افسوس صد افسوس کہ تقسیم ہند کے بعد اردو زبان تعصب کا شکار ہوئی اور جسے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی تھی وہی پچھواڑے کھڑی سسکنے لگی اور ہندستان کی گنگا جمنی تہذیب کی غماز جس کی آبیاری میں ہندو مسلم دونوں نے یکساطور پر خون جگر بہایا ہے اور آج بھی اس کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔

الغرض اردو زبان وادب کے ارتقائی سفر میں اس کے دامن میں گوناگوں گل و بوٹے سجنے کھلے اور زینت حسن وزیبائش بنی۔ ایک سے بڑھکر ایک فنکاروں نے ادبی سفر کو بڑھایا تقویت اور صنفی و معنی اعتبار سے جدید ترین رجحانات سے آشکار کرایا کہ اردو زبان وادب عالمی ادب کے مقابل کھڑی ہوکر اپنی رنگینی و جاذبیت سے لوگوں کو راغب کرنے لگی۔ اس کے دامن میں طرح طرح کے اصناف ادب نے ترقی کی اور اپنی خصوصیت وانفرادیت کو عالمی پیمانے پر تسلیم کرنے پر مجبور کیا مثلاً غزل۔ غزل نے وہ شہرت دوام حاصل کی ہے کہ ملک اور بیرون ملک کی تمام زبانوں میں اسکی تغزل کی خوشبو سے سارا چمن مہک اٹھا ہے۔

☆☆☆

اردو ادب آزادی کے بعد

آزادی کے بعد اردو ادب پر تقسیم ہند کا بڑا گہرا اثر دیکھنے کو ملتا ہے دوران آزادی دو قوموں کے درمیان دو لسانی تنازعہ نے نفرت اور تناؤ نے ادب کو بری طرح متاثر کیا۔ رہی سہی کثر فسادات نے پوری کردی۔ غرض کہ آزادی کے بعد قیام پاکستان اور آزاد ہند میں اردو پر دباؤ بڑھنے لگا جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ جو زبان انگریزی حکومت کے آخری دور میں سرکاری دفتری اور عدالتی زبان تھی اسے پش پشت کردیا گیا تقسیم ہند کی وجہ کر لوگ اپنے اپنے گھروں سے بیزار ہو گئے اپنے وطن میں اجنبی ہو گئے۔ ادھر سے ادھر جانے میں کارواں حیات تباہ ہو گیا۔ آبادی کا تبادلہ قیامت خیز ثابت ہوا۔ پورا ملک حشر کا میدان بن گیا۔ قوموں کے درمیان نفرتوں نے مذہب کے نام پر وہ خون ریزی کی گئی کہ ہر شریف آدمی انگشت بدنداں تھا کس نے زیادتی کی اور کس نے اپنے قوم کا نام بڑا کیا اسکا فیصلہ مستقبل خود کرے گا لیکن دیکھا یہ گیا کہ جسکو جہاں موقع ملا اپنا غصہ نکال لیا۔

حیات مجروح ہوگئی، سماجی و اقتصادی زندگی پائمال ہوگئی عوام و خواص آزادی کے مفہوم کو اچھی طرح سمجھ نہ سکے اور نہ ہی اس کے تقدس کا احترام کر سکے۔ بہر حال اس حالت میں بھی زندگی چلتی رہی اور جس طرح چلی اس کی تصویر ادب میں دیکھی جا سکتی ہے اس کے اشارے جو ہمارے ادب میں 1947ء کے بعد سے ملتے ہیں صاف صاف اپنی اہمیت واضح کر سکیں۔ ساتھ ہی ساتھ ادیبوں کی فنی کاوشوں کی عظمت کا بھی احساس ہو سکے کہ ادیبوں نے کس حسن و خوبی کے ساتھ ان واقعات کا ذکر کیا ہے آزادی کے بعد ادیبوں کے پاس لکھنے کے لئے بہت مواد تھا۔

جنگ آزادی کے سرماؤں کے بہادری کے قصے۔ فرنگیوں کے ناپاک ارادے فسادات کے تلخ اور کراہ آمیز تجربات قحط بنگال، جمہوریت، کمیونزم اور دم توڑتی ہوئی ترقی پسند تحریک اس طرح موضوع و مواد کے لحاظ سے ادیبوں نے تجربے کئے اس میں کچھ کامیاب بھی ہوئے اور بہت ناکام بھی۔ ان حالات کا اثر ملک و ادب دونوں پیر برابر پڑتا رہا۔ اور ادب میں گاندھی جی کے قتل پر ایک ضخیم ذخیرہ جمع ہو گیا فرقہ وارانہ فسادات پر جو کچھ لکھا گیا اس کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ادب نے اپنے فرائض کس خوبی سے انجام دئے ہم کو جس ماحول میں آزادی ملی وہ حالات کتنے خطرناک تھے حصول آزادی کے بعد

جو جوش و مسرت کا اظہار ہونے چاہئے تھا اس تناسب میں بہت کم رہا۔ سرنارتھیوں اور مہاجرین کے مسائل اس شدّت کے ساتھ حکومت کے سامنے آئے کہ پورا ملک شدید حدّت میں مبتلا ہوگیا۔ ایسے پر آسوب ماحول میں ادیبوں نے جواں مردی کا مظاہرہ کیا اور ہر شبعہ حیات و ممات کی افادیت اور سماج کو مزید تباہی و بربادی کے دبانے سے ثابت نکال لئے جانے کی کوشش ہونے لگی یہ تمام کاوِیش نثر و نظم دونوں میں دیکھنے کو ملتا ہے۔

غزل عام طور پر عشق و عاشق کے موضوع پر لکھی جانے والی صنف ہوتے ہوئے بھی غزل گو شاعروں نے مذکورہ موضوع پر فلسفیانہ، عالمانہ، بھائی چارہ اور قومی یکتا کی نغمہ سرای کی ترنم۔ داخل پہلو کی ہمواری یک رنگی، جذبات اور ذہنی کیفیت کے اظہار پر خاص توجہ کی گئی ہے تقع اور لفظی بازی گری سے بچا گیا ہے بلکہ اس میں روانی بندش کی چستی اور موسیقیت اور لطیف پر معنی کنایات غزل کی امتیازی خصوصیت سے عام طور پر غزلوں میں فلسفہ حیات اور حقیقت ہستی کا ذکر ملتا ہے وہیں تصوف اور مسائل تصوف کو شعراء نے اپنی انفرادی لب و لہجہ سے عشق حقیقی اور مجازی مسئلہ حیات سے قریب تر ملتے ہیں۔

آزادی کے بعد غزل کو کافی ترقی اور شہرت حاصل ہوئی کیونکہ حالات کے ساتھ ساتھ لوگوں کے نظریات بھی بدلنے لگے ہر وہ شخص جو شاعری کی طرف رجوع کرتا ہے تو وہ غزل سے ہی ابتداء کرتا ہے اس کے کئی اسباب رہے ہیں۔ شاعروں کو قبل کے مقابلے زیادہ کھلی اور آزاد فضا ملی، کھل کر اظہار خیال کا موقع ملا، موضوع اور اسالیب میں بھی وسعت حاصل کی۔ غزل درباروں سے نکل کر بڑے بڑے اسٹیج۔ ریڈیو اسٹیسن۔ ٹی وی، اسٹیشن نے لے لیا جہاں سے شاعروں کی عزت افزائی اور شہرت میں اضافہ ہونے لگا۔ فلم انڈسٹری میں تو شاعروں کی ایک بڑی تعداد ملتی ہے لیکن وہ جنہوں نے غزل میں اپنا مرتبہ حاصل کیا ان میں اصغر گونڈی، جگر مرادآبادی، بشیر بدر، مظہر امام، جگن ناتھ آزاد، رؤف خیر، مدحت الاختر، کوثر صدیقی، خورشید اکبر، عالم خورشید، کوثر مظہری شاداب رضی منور رعنا، آصف وغیرہ۔

نظم میں زیادہ ترقی نہیں ہوئی۔ اتنا ہوا کہ بچوں کے لئے کچھ اچھی نظمیں لکھی گئی۔ مرثیہ مثنوی، قصیدہ وغیرہ صنف شاعری کے قدرداں نہیں رہنے کی وجہ کران صنفوں میں شاعروں نے کچھ خاص نہیں کیا کیونکہ دور حاضر میں شاعری ذوق سلیم کو پورا تو کرتا ہی ہے ساتھ ہی ساتھ معاونت بھی حاصل ہوتی ہے اور حاضر میں مرثیہ، مثنوی اور قصیدہ کے قدرداں کے نہیں رہنے سے اس فن کی طرف لوگوں کا رجحان بہت کم ہوا۔ مرثئے کا تعلق عقیدہ سے ہونے کی وجہ کہ یہ فن اب بھی زندہ ہے لیکن کوئی خاص ترقی نہیں کر رہی ہے آزاد نظم کو فروغ ملا اس کے بہت اچھے نمونے ملتے ہیں۔

نثری حصے نے بہت ترقی کی ناول، افسانہ، تنقید تحقیق، مضامین وغیرہ نے کافی ترقی کی اور اس کے بڑے بڑے نامور ادیب نے اپنے کارناموں سے اردو ادب کی سمت کو ایک نیا آیام عطا کیا مغربی علوم وفنون پوری طرح سے مغلوب ہوگئی ڈراما نگاری نے بھی ترقی کی اسٹیج پوری آب وتاب کے ساتھ جلوہ افروز ہوئی وہیں فلموں تک رسائی کا ایک زریعہ بنی اس میں آغا حشر رحمت علی ابراہیم اور محشر وغیرہ اچھے اور کامیاب ڈرامے لکھے۔ آزادی کے بعد نثر میں کئی نئے نئے گوشے کھلے اور اچھی خاصی طبع آزمائی بھی ہوئی ناول سے ناولٹ۔ افسانہ مختصر افسانہ اور اب افسانیت وغیرہ لکھا جارہا ہے اس فن کے ماہروں میں سجاد حیدر یلدم سلطانہ حیدر جوش مجنون، جلیل قدوائی علی عباس حسینی، اختر رائے پوری کرشن چندر سعادت حسین منٹو راجندر سنگھ بیدی سہیل عظیم آبادی، اوپندر ناتھ اشک، عصمت چغتائی۔ قراۃ العین حیدر اختر اور رینوی شکیلہ اختر وغیرہ نے اردو ناول اور افسانہ میں مغربی ادب کے قریب لانے میں کافی اہم کردار ادا کیا ہے، تنقیدی میں کلیم الدین احمد احتشام حسین، عبداللہ، رسید احمد صدیقی فراق گورکھپوری، عبدالمغنی وغیرہ نے تنقید کے فن کو معراج کمال تک پہنچادیا۔ تحقیق میں قاضی عبدالودود، مسعود حسین خاں، مختارالدین آرزو سید سلمان ندوی شوکت سبزواری وغیرہ تحقیق کو ایک معیاری بنایا۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ آزادی کے بعد اردو ادب ہر جہت میں ترقی کی ہے شاعری کے کچھ صنفوں کا زوال ہوا لیکن دیگر اصناف نے کافی ترقی کی اور عالمی ادب کے شانہ بہ شانہ کھڑی نظر آتی ہے۔

☆☆☆

اردو ادب کی تحریکیں

تحریک ایک سوچی سمجھی اجتماعی کوششوں کا مثبت نتیجہ ہے۔ اردو میں ابتداء سے لیکر آج تک مختلف تحریکوں نے ادب میں نکھار اور فکر کے ساتھ ساتھ قابل قدر سمت عطا کی ہے اردو ادب کی ابتدائی دور کا جائزہ لیتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ زبان میں بہت ایسے الفاظ ومحارے شامل تھے جو مقامی اور غیر ادبی تھے بطور تحریک کے مرزا مظہر جان جاناں نے پہلی کوشش کی کہ ویسے الفاظ ومہاورے کو متروک قرار دیا جو زبان کی چاشنی اور جاذبیت کو مجروح کرتی ہے۔ ان کی اس تحریک سے اردو ادب حرفی ہجے اور غیر ادبی مہاورے والفاظ کی جگہ فارسی مہاورے اور الفاظ شامل کیا اردو ادب کو اغلاط معنوی وامساوی سے پاک کیا مرزا کی یہ کوشش بہت ہی کامیاب اور کارگر ثابت ہوئی اس کے بعد ہی سے شعراء وادباؤ میں شعوری بیداری آئی کہ زبان کو کس طرح اغلاط سے پاک کیا جا سکتا ہے اس سے ایک بات یہ ہوئی کہ اردو ادب پر فارسیت غالب ہوتی گئی۔

اردو کی مقبولیت اور شہرت کو دیکھتے ہوئے انگریزی سرکار نے یہ محسوس کیا کہ انگلستان اور ہندستان کے درمیان خلاء کو پاٹنے والی زبان اردو ہے کیوں کہ یہی زبان پورے ہندوستان میں مسترک طور پر بولی اور سمجھی جاتی تھی اور ہندوستان میں اپنی حکومت کو مظبوط بنانے کے لئے انگریز اور ہندستانی کے بیچ کھائی کو پاٹنے کے واسطے اردو کو انگلستان سے آنے والوں کے لئے سکھایا جائے اور اپنی بات ہندوستانیوں تک پہنچانے کے لئے ان کی اپنی زبان ہندستان میں کہی جائے مذکورہ وجوہات کی بنیاد پر فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں آیا۔ اس ادارہ میں زیادہ تر کام ترجمہ کا ہوتا تھا تصنیف کا کام بہت کم ہوا ہے۔ بالخصوص اس کے علمی وادبی خدمات سے انکار کی گنجائش نہیں ہے جان کل کرائسٹ صدر فورٹ ولیم کالج ہونے کے ناطے انکا ماننا تھا کہ زبان کو عام فہم اور قریبا المعنی کے ساتھ قریب العوام بھی ہو جو آسانی کے ساتھ عام عوام کی سمجھ میں آسکے۔ مسجع مرسع نثر کی جگہ عارمی نثر نے زور پکڑا جس کی رسائی عام انسانوں تک آسانی سے ہونے لگی اس کے روح رواں میر امّن، للولال جی، مرزا علی لطف میر، شیر علی افسوؔس، سید حیدر بخش حیدری، نہال چند لاہوری وغیرہ قابل ذکر ہیں آج ہم جس نثری ادب کا استعمال کررہے ہیں اس کی ابتدا فورٹ ولیم کالج سے ہی ہوئی تھی۔ اس لئے اردو زبان وادب پر اس تحریک کا بہت بڑا احسان ہے فورٹ ولیم کالج نے ایک عظیم الشان المیہ پیش کیا وہ تھا اس زبان کو دو مختلف رسم لخط میں تحریر کرنے کی ابتدا یعنی کے ایک کو فارسی رسم لخط میں لکھنے کو کہا اور دوسرے کو دیوناگری میں یہیں سے ہندی اردو کا تنازعہ شروع ہو گیا۔ یہ تحریک ایک طرف قابل

قدر ہے تو دوسری طرف قابل مزمت کیوں کہ ہندوستانیوں کو لسانی اعتبار سے دو خانوں میں تقسیم کر دیا گیا جسکا زور آج شدت کے ساتھ محسوس کیا جا رہا ہے۔

سر سید احمد خاں کا اردو ادب پر احسان عظیم ہے کیونکہ سر سید نے British Indian Association نام سے ایک ادارہ قائم کیا جو بعد میں سر سید تحریک یا علی گڑھ تحریک میں بدل گئی۔ دراصل سر سید کا خیال تھا کہ اگتے ہوئے سورج کی پوجا کرنی چاہئے کیونکہ 1857ء میں مسلمانوں کی رہی سہی حکومت ختم ہو گئی تھی انگریزوں کا اقبال عروج پر تھا اس لئے کامیاب زندگی کے لئے ہر عروج کے ساتھ ہو جانا چاہئے اسی مقصد کے تحت تہذیب الخلاق کے ذریعہ تحریک چلائی اور یہاں یہ بھی قابل ذکر ہے کہ قارئین ادبی و سماجی بیداری بھی لانے کی کوشش کی مسلمان سابقہ کامیابیوں کی کہانی سنتے اور سناتے آرہے تھے قصے اور کہانیوں داستانوں کا زور تھا جہاں مافوق الفطرت عناصر کا غلبہ ہوا کرتا تھا۔ جس سے انسانی ذہن ان ہی کی طرح غیر فطری فعال کی امید میں رہا کرتے تھے۔ اس خواب پارینہ کو انہوں نے توڑنے کی کوشش کی اور حقیقت سے نظر ملانے کی تلقین کی غرض کہ ادب میں غیر فطری عناصر کی جگہ حقیقت نگاری نے کی۔ ان کے رفیقوں میں سید مہدی علی محسن الملک، چراغ علی، ڈپٹی نذیر احمد وغیرہ نذیر احمد نے داستانوں کی جگہ اصلاحی و معاشرتی ناول لکھ کر اردو ادب میں انقلاب پیدا کر دیا۔

محمد حسین آزاد نے لاہور میں ایک ادارہ قائم کیا۔ اس کے ذریعہ اردو شاعری میں انہوں نے انقلاب برپا کر دیا۔ اپنے اس انجمن کے ذریعہ مصرع ترح دیکر غزل نہیں لکھوائی بلکہ عنوان دیکر نظم لکھوائی یعنی کہ ہر مہینے مشاعرہ ہوتا تھا جس میں ایک موضوع پر عنوان دیدیا کرتے تھے اس سے اردو ادب میں نظم نگاری بالخصوص نیچرل شاعری کی شروعات ہوئی۔ انہوں نے خود بھی نظم لکھی اور سریک مشاعرہ کے شاعروں سے بھی نظمیں لکھوائیں اس طرح اردو ادب میں نیچرل شاعری کی طرف شاعروں کا رجحان بڑھا اور ایک نئے فکر و طمازت کے ساتھ ایک بڑا طبقہ نیچرل شاعر کی طرف راغب ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ الطاف حسین حالی کا شہرہ آفاق تخلیق ''مدجزر اسلام'' اسی تحریک کا نتیجہ ہے

سید سلمان ندوی نے ''دارالمصنفین'' کے نام سے حیدر آباد میں میں ایک انجمن قائم کیا جہاں سے ادیبوں کو تاریخ، جغرافیہ فلسفہ اور دیگر علوم دینوی و دیناوی کی تحریک چلائی جس کی وجہ کر بڑی تعداد میں ایسے اہل قلم سامنے آئے جن کی کوششوں اور کاوشوں کی وجہ کر مختلف علوم وفنون سے اردو کو روشناش کرایا، سید سلمان ندوی کی تحریک کے ذریعہ تصنیف وتالیف کی گئی ادب اور ادب کا ایک عظیم کارنامہ ہے۔

ترقی پسند تحریک 1935ء انگلستان میں سجاد ظہیر اور ان کے دوستوں کا نتیجہ ہے یہ تحریک کئی

اشباب سے مثلاً سیاسی، معاشی، اقتصادی اور معاشرتی صنعتی اور مشینی انقلاب نے پوری دنیا کو اپنے آغوش میں لے چکی تھی صنعت کے فروغ میں مشینوں کا بہت ہی بڑا اور اہم رول رہا ہے سائنس وٹکنالوجی نے صنعت کو جنم دیا اور صنف کے فروغ کے لئے بازار کی ضرورت ہوئی بازار کے لئے دور دراز کے ملکوں سے ربط اور مقابلائی کشمکش شروع ہوگئیں۔اس کا اثر سماجی زندگی پر پڑا دب اس مشتثنا کیسے رہتی لہٰذا اس میں بھی نئے نئے رجحان جنم لینے لگے ترقی کا عروج انتہا کو پہنچ رہا تھا جمہوری نظام کی آواز بازگشت فضا میں گونجنے لگی تھی غلامی انگڑائی لیکر تنومند ومتنوع ہوکر آزادی کی فضا میں جینے کا خواب دیکھنے لگے۔روس میں کمنسٹوں کی انقلاب نے کمزور ومزدور طبقہ میں زندگی کی نئی توانائی بھر دی غرضکہ کہ پورا عالم متزلزل ہونے لگا حالات نے لوگوں کو سوچنے پر مجبور کیا سجاد ظہیر اور ان کے دوستوں نے ایک منی فسٹی کے ذریعہ اردو ادب میں ایک تحریک کی بنیاد رکھی۔اس کا اثر اتنا ہوا کہ پرانے اور نئے شعراء ادیبوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور پریم چند جیسا ادیب یہ کہنے پر مجبور ہوگیا کہ اب وقت آگیا ہے کہ حسن کا معیار بدلہ جائے۔"

اس طرح ترقی پسند تحریک نے نہ صرف اردو بلکہ ہندوستان کی دیگر زبانوں میں بھی اپنا اثر دیکھا یا الفاظ تو وہی رہے لیکن اس کے انداز بدل گئے۔آزادی کی لڑائی میں اس نے گھی کا کام کیا جوش اور جذبہ کو شعلہ بنا دیا۔

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

آزادی کے بعد تقسیم ہند نے ادب پر بہت گہرا اثر چھوڑا ترقی پسند تحریک کا زور کم ہونے لگا لوگوں کے سوچ میں تبدیلی اور تحریک میں برائی نظر آنے لگی تب لوگوں نے جدیدیت کا نعرہ بلند کیا جس میں صنف سخن میں جدت کا مظاہرہ کرتے ہوئے نئے نئے اسالیب سے روشناش کرایا تراجم ہونے لگے فن شاعری کی صنعت گری میں آزاد شاعری شروع ہوئی نئے نئے معنی اختراع کئے گئے تشبیح واستعارہ کے وسیع میدان کھلے۔اب لوگ مابعد جدیدیت کی طرف مائل ہیں۔

الغرض اردو ادب میں جتنی بھی تحریکیں آئیں سبھوں نے کچھ نہ کچھ ادب کو دیا آج ہم جس شان سے اردو غزل کو عالمی سطح پر پیش کرتے ہیں اس میں مذکورہ تحریکیوں کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہے۔

اردو غزل کا ارتقاء

غزل عربی زبان کا لفظ ہے اس کے لغوی معنی معشوق یا اپنے محبوب یا عورتوں کے ساتھ بات چیت۔وہ باتیں جو عورتوں کے عشق یا ان کے وصف میں بیان کی جائیں صنف شاعری میں غزل حسن و جمال، فراق و وصال، عشق و فریفتگی ،شراب و کباب فنا و معرفت وغیرہ کا ذکر اور عاشق وصال و فراق کے خیالات کو وسعت دیکر دل کے ارمان یا غم کا بخار نکالے فنی اعتبار سے ایک غزل میں کم سے کم پانچ اشعار اور زیادہ کی قید نہیں ہے لیکن یہ طاق ہو۔اسکا ہر شعر ہم ردیف و قافیہ ہوتا ہے اس کے پہلے شعر کو مطلع کہتے ہیں جسکا دونوں مصرع ہم ردیف و قافیہ ہوتا ہے اگر دوسرے اور تیسرے شعر کا دونوں مصرع بھی ہم ردیف و قافیہ ہوتا ہے تو اسے حسن مطلع کہتے ہیں۔اس کے آخری شعر میں شاعر اپنا تخلص پیش کرتا ہے اسے مقطع کا شعر کہتے ہے۔

اب تک کی تحقیق غزل کے ارتقائی سفر کا محاکمہ کرتی ہوئی وہیں آکر رک جاتی ہے جہاں محمد حسن آزاد نے اردو کا پہلا غزل گو شاعر امیر خسرؔو کو قرار دیا ہے ابتدائی کاوشوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ غزل کا مزاج کیا تھا اور فارسی سے اردو میں منتقل کرتے ہوئے وہ تمام جذبات و کوائف اردو میں چلے آئے ہیں امیر خسرو فرماتے ہیں ۔

شبان ہجراں دراز چوں زلف و روز وصلت چو عمر کاتاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

امیر خسرؔو کو اردو کا پہلا شاعر اور ان کی غزل کو پہلی کوشش تھی۔امیر خسرؔو کی غزل کا ایک مصرع فارسی کا ہے تو دوسرا ہندوستانی یا کھڑی یا اردو کا اس طرح اردو غزل کے ابتدائی نمونے امیر خسرو کے بعد دکنی شعراء کے یہاں ملنے لگتے ہیں شاہ میرا جی جانم، اور سلطان محمد قلی قطب شاہ کو پہلا صاحب دیوان شاعر تسلیم کیا گیا ہے ان کے دیوان میں دیگر اصناف سخن کے ساتھ ساتھ اچھی خاصی تعداد میں غزل بھی ہے۔یہ غزل مکمل طور پر فارسی مادہ کے راہ پر مقامی رنگ ڈوبا ہوا ہے ان کے بعد سلطان محمد قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ غزل میں طبع آزمائی کی ان کے بعد نشاطی، غواصی، قطبی، نورؔی اور ہاسم وغیرہ شاعروں نے غزلیں لکھیں لیکن ان لوگوں کا زور قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ کی طرف زیادہ تھا۔ان لوگوں کے بعد ولؔی دکنی کا زمانہ آتا ہے۔انہوں نے غزل کی اسطرح ترقی کی اور جاذب بنایا کہ جب وہ دلی آئے تو نقالوں قوالوں اور نوجوانوں کی زبان پر ولی کی غزل سنائی پڑتی تھی ولؔی کی غزلوں کی شہرت اور مقبولیت کو دیکھتے ہوئے

فارسی گو شاعر نے اردو شاعری کی طرف رجوع کیا اور غزل محفلوں اور مشاعروں میں سننے اور سنانے لگے۔
غزل معنوی اعتبار سے اپنی رنگینی اور حسن بیانی کی وجہ کرنو جوانوں سے لیکر بزرگوں کے دلوں کو گدگدانے
لگی اس صنف میں نو جوانوں کو اس کی معشوق نظر آنے لگی اور بزگوں کی نگاہ میں معشوق حقیقی کی جلوہ نمائی
غرض کہ عارفانہ کلام غزل کے ساخت میں سمانے لگا۔ ولی کہتے ہیں ۔

تجھ لب کی سفت لعل بدخشاں سوں کہوں گا
جادو ہیں تیرے نین غزالاں سوں کہوں گا

غزل کا انداز بیان اس کی صفائی اور سادگی تشبیہوں، نازک اشتعاروں نے غزل کی رونق میں
اضافہ کرتی رہی اور ہر وہ شخص جو شاعری کی طرف رجوع کرتا پہلے پہل وہ غزل کے میدان میں قدم رکھتا۔
اب تک تاریخ ادب کے مصنفوں نے شاعری کے جتنے ادوار قائم کئے ہیں اسکا اگر ہم سلسلے
وار ذکر کریں تو ہر دور ہر اسکول اور ہر مکتبۂ فکر کے لوگوں نے غزل سے بے پناہ رغبت کا اظہار کیا خود بھی
پسند کیا اور سامعین کو بھی اس کوچے کی لذت سے محظوظ ہونے کے لئے مجبور کر دیا۔ عرض کہ غزل کے سفر
میں بیدلؔ۔ آرزوؔ، آبروؔ، مضمونؔ یک رنگ حاتمؔ سوداؔ اور میر تقی میرؔ نے غزل کو کمال عروج عطا کیا۔ میر اور
غزل دونوں ایک دوسرے کے ہو کر رہ گئے میرؔ نے غزل میں سوز و گداز، شیرینی ملاحت، صداقت جذبات
اور عشق کی واردات کو اس حسن و صداقت سے بیان کرتے ہیں کہ تاثیر کی رورگ وریشہ میں دوڑ جاتی ہے ۔

تھا مشتعار حسن سے اس کے جو نور تھا
خورشید میں بھی اس ہی کا ذرّہ ظہور تھا

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا

خواجہ میر دردؔ صوفی بزرگ تھے غزل کی شہرت اور جاذبیت نے ان کے دل کو موہ لیا اور دردؔ بھی
اس گلی کے مریض درد ہو گئے لیکن ان کی عارفانہ کلام میں عشق حقیقی کی خوشبو اور مجاز کی کھنک ملتی ہے انہوں
نے غزل میں فکر کو جگہ دی ۔

ارض و سماں کہاں تیری وصعت کو پاسکے
ایک میں ہی ہوں جہاں تو سما سکے
جگ میں آکر ادھر ادھر دیکھا   تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

مزید تقویت بخشی انشاؔ، مصحفیؔ، ناسخؔ، راسخؔ عظیم آبادی، آتشؔ وغیرہ اردو غزل کے سفر کو بڑھایا اب اسکولوں اور مکتبہ فکر کے لوگوں کی جماعت گروہ بند ہوکر غزل کے معیار میں اپنے مذاق سلیم کی بنیاد پر الگ الگ وضاحتیں پیش کرنے لگے اردو شاعری غزل کے سفر میں وہ لوگ شامل ہوتے ہیں جن پر آج بھی اردو دنیا رشک کرتی ہے وہ ہیں ذوقؔ، غالبؔ، مومنؔ اور شادؔ عظیم آبادی وغیرہ۔

ذوقؔ و غالبؔ کی چشمک نے غزل کو خوب ترقی دی اور غالبؔ کو اردو شاعری پر غالب کر دیا۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا

کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

مومنؔ کی نازک خیالی، معاملات فہمی عشق کی نزاکت ندرت خیال اور حسن تغزل نے غزل کے سفر میں چار چاند لگایا غزل کے اگلے پڑاؤ میں داغؔ، امیرؔ، حسرتؔ موہانی، اکبرؔ الہ آبادی اور علامہ اقبالؔ شریک ہوتے ہیں مزکورہ شعراء نے اپنے اپنے جوہر فن سے غزل کو چمکایا اور خود بھی چمکے لیکن علامہ اقبالؔ نے غزل کو فلسفہ حیات و ممات سے قریب کرا سے حد تک ترقی دی کہ غزل میں ہر وہ علوم وفنون کے فکر و فن کو شامل کیا جانے لگا۔ غالبؔ نے بھی کچھ اور چاہئے وصعت خیال کا رونا روتے رہے لیکن علامہ اقبالؔ نے اس تشنگی کو دور کر دی اور وصعت خیال کو فروغ دیا۔

اصغر گونڈوی، جگر مراد آبادی، فانی بدایونی، جوش ملیح آبادی، پرویز شاہدی رمز عظیم آبادی شکیل بدایونی وغیرہ شاعروں نے غزل کے میدان میں طبع آزمائی کی اور غزل کے معیار کو بلند کیا۔

☆☆☆

اردو کی دیگر شعری اصناف

شاعری ایک باشعور ماہر عروض کے ذہنی ترنگ کا نام ہے شاعرو ادیب ایک حسّاس دل وسیع ذہن اور مناظر فطرت کا ترجمان ہوتا ہے۔ اس کے سامنے سماج اور ماحول میں جو واقعات وحادثات رونما ہوتے رہتے ہیں اس سے وہ بری طرح متاثر ہوتا ہے اور اپنے جولان طبیعت کے مطابق وہ اسے صفحہ قرطاس پر اتار دیتا ہے یہ ذہنی ترنگ نغمہ وسرور کی شکل میں مترنم ہوتی ہے جو قارئین وسامعین کے دل ودماغ کو مسرور انبساط عطا کرتی ہے۔ انسان محض توجیہہ واستدلال سے ہی کسی بات کو اپنے دل میں محسوس نہیں کرتا بلکہ وہ اس معاملے میں جذبات کا بھی خوگر ہے۔ یہاں شاعر اس کے کام آتا ہے کیوں کہ وہ جہاں خارجی چیزوں کو داخلی طور پر پڑھتا ہے اور ان کے انسانی رشتوں پر روشنی ڈالتا ہے پھر اپنے احساسات وتخیل کے ذریعہ ان کی قربت حاصل کر لیتا ہے اور انہیں زندگی کی ڈور سے جوڑ دیتا ہے ایسا کرنے میں شاعر مبالغہ سے بھی کام لیتا ہے جہاں تک شاعری میں احساسات کا تعلق ہے یہ شاعری کی روح ہے یہ احساس خیال کو جنم دیتا ہے اور خیال شاعری کا سب سے اہم جزو ہے۔ خیال شاعری کے ذہن میں اس طرح داخل ہوتا ہے کہ اس کی ہیت سائے کی طرح اس کے ساتھ ساتھ رہتی ہے گویا تخلیقی عمل ان دونوں کو بیک وقت محسور کر لیتا ہے۔ شاعری ایک شعوری عمل کا نتیجہ ہے کیونکہ شعر کے لئے ضروری ہے کہ شاعر کو تخلیق کرتے وقت اس کا احساس ہو اور یہ احساس جتنا زیادہ شدّت سے ہوگا شاعر کا قلب اتنا ہی زور کا دھڑکے گا اور یہ جتنا زیادہ دھڑکے گا اتنا ہی زیادہ معتبر اشعار تخلق کرے گا۔

جہاں تک صنف شاعری کا سوال ہے تو اردو میں رزمیہ، طربیہ اور تمثیلی شاعری کے تحت مثنوی، مرثیہ، قصیدہ، غزل، نظم ، رباعی، نعت، حمد، اور قطعہ وغیرہ اہم اور خاص ہیں۔

غزل:۔ معنوی اعتبار سے غزل معشوق سے گفتگو کرنے کے ہیں یہ گفتگو مسائل زندگی سے متعلق نہیں بلکہ یہ گفتگو پیار کی ہے۔ غرضکہ محبوب ومحبوبہ کے درمیان عشق ومحبت اور راز ونیاز کی باتیں، حسن وعشق کے درمیان سوخی وناز کی باتیں، وعدے وفا، دھوکہ، فریب، عاشق پر جان نچھاور کرنا جدائی کے کرب سے تلملا کر فراق یار میں تڑپنا، وصل کے انتظار میں کروٹیں بدلنا غرضیکہ ہر وہ لمحہ جو دوران عشق دونوں فریق پر گذرتے ہیں یا محسوس کرتے ہیں غزل میں بیان کی جاتی ہیں لیکن صوفی شاعروں نے اس عشق مجازی کے بجائے عشق حقیقی کی طرف مائل کر دیا ہے غالبؔ اور اقبالؔ نے مسائل تصوف اور کشمکش زندگی سے منسلک کر غزل کے وصف کو مہمیز عطا کی ہے۔

یہ مسائل تصوف یہ تیرا بیان غالبؔ
ہم تجھے ولی سمجھتے جو نہ تو بادہ خوار ہوتا

اردو شاعری کا سب سے زیادہ محبوب ترین صنف سخن غزل ہے غزل کی لطافت اس کی ایمائیت، اثر آفرینی اور اختصار و نرمی اس کی شان امتیاز ہے۔ شاعری کا وہ عنصر ہر دور اور ہر زمانے میں زندہ اور ہر دلعزیز رہ سکتا ہے جس نے انسانی ذہن و دل پر حکمرانی کرتی ہو وغزل کے اجزائے ترکیبی اور رموز عشق ہر نوجوان کے دل کی دھڑکن ہے اس لئے آج بھی غزل اتنی ہی ہر دلعزیز اور من پسند صنف ہے کسی بھی زبان کے شاعری میں اتنی مقبولیت اور شہرت کسی صنف کو ملی ہو۔

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں
میرؔ

ہوگا کسی دیوار کے سائے میں پڑا میرؔ کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو
میرؔ

شب فراق میں اکدم نہیں قرار آیا خدا گواہ ہے، شاہد ہے آرزو تیری
آتشؔ

عشق پہ زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے
غالبؔ

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
مومنؔ

تجھ لب کی صفت لعل بدخشاں سوں کہوں گا جادو ہے تیرے نین یہ غزالاں سوں کہوں گا
ولیؔ

یہ بزم مئے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی جو بڑھ کہ خود اٹھالے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے
شادؔ

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیر امم کیا ہے شمشیر و سنا اوّل طاؤس ورباب آخر
اقبالؔ

مثنوی:۔ اردو شاعری کی پسندیدہ صنف شاعری ہے یہ عربی زبان سے مشتق ہے اس کے لغوی معنی دودو کیا گیا کے ہیں ۔فن شاعری اُس صنف سخن کو کہتے ہیں جسکا ہر ایک بیت کا قافیہ علحدہ علحدہ ہوتے ہیں

۔غرضکہ مثنوی اس نظم کو کہا جاتا ہے۔جس میں ہر شعر کے دونوں مصرعے مقفّٰی ہوں اور ہر شعر دوسرے شعر کا قافیہ الگ ہوں۔اس کے لئے اوزان مقرر کر دیئے گئے ہیں اس کے اجزائے ترکیبی توحید،مناجات، مدح حاکم کی تعریف شعر و سخن،سبب تالیف اور اصل قصہ،

مثنوی میں حسن و عشق کا قصہ مافوق الفطرت کا غلبہ اور اس میں ایسے واقعات و حادثات بیان کئے جاتے ہیں جو عام ذہن سمجھنے سے قاصر ہے۔اردو میں چند مشہور مشنویا ہیں قطب مثنوی سحرالبیان ، گلزارنسیم،وغیرہ بے حد کامیاب اور مشہور مثنوی ہے۔

مرثیہ:۔ مرثیہ ایک صنف سخن ہوتے ہوئے بھی ایک خاص طبقہ کے عقیدت مندوں کا محبوب ترین شاعری ہے اس میں مرنے والوں کے اوصاف رجز و طب سے ایسا سماں باندھ دیا جات ہے کہ سامعین غموں کے اتھاہ سمندر میں غوطیہ لگانے لگتے ہیں یہ اردو شاعری کا بیش بہا خزانہ ہے اس صنف میں اوّل چہرہ سراپا رحلت، جز، جنگ،شہادت اور بین کا ذکر کیا جاتا ہے۔اس صنف سخن میں تقریباً قدما کے سبھی شاعروں نے طبع آزمائی کی ہے لیکن خصوصیت کے ساتھ میر ضاحک اور میر انیسؔ،مرزا دبیرؔ کے چشمک نے اس فن کو آسمان آدب پر لا کھڑا کیا۔

لاشوں پہ لائیں بیویاں زینب کو تھام کے
ماتم کی صف پہ گر پڑی وہ سوختہ جگر

انیسؔ

قصیدہ:۔ اردو شاعری کا مقصدی صنف سخن قصیدہ ہے اس کی بھی ابتداء عرب سے ہوئی اور یہ صنف عربی سے فارسی اور فارسی سے اردو میں منتقل ہوئی قصیدہ حاکم وقت،نواب جاگروار۔روسوا کی شان میں ان کی بڑائی بیان کر انعام و اکرام حاصل کیا جاتا تھا۔اس میں تشبیب، گریز، مدح، دعا یا حسن طلب ہوتا ہے سوداؔ پہلے شاعر میں جنھوں نے قصیدہ نگاری کو باقائدہ فن کی حثیت سے انتہائی بلندیوں تک پہنچایا۔

نظم:۔ اردو شاعری میں ہر کلام موزورں کو نظم کہا جاتا ہے لیکن اصطلاح میں نظم سے مراد شاعری کا وہ صنف و اسلوب ہے۔جس میں کسی خاص موضوع پر ربطہ،تسلسل کے ساتھ اظہار خیال کیا گیا ہو۔''اور زندگی کے مسائل جذبات و احساسات اور خیالات کی ترجمانی کی گئی ہو۔اردو میں نظم کی ابتدا محمد حسین آزادؔ کی کوششوں اور کاوشوں کا نتیجہ ہے انہوں نے لاہور میں ایک انجمن قائم کیا تھا اور مشاعرے میں مصرع کی جگہ عنوان دیا جاتا تھا۔حالیؔ کا مدو جزر اسلام،انہیں کاوشوں کا گلدشتہ ہے اسمٰعیل میرٹھی،چکبستؔ،اکبرؔ الہ آبادی،علامہ اقبالؔ جوشؔ ملیح آبادی،فراقؔ مخدوم،مجازؔ احسان دانش فیضؔ احمد وغیرہ شعرا نے اس راہ میں

عمدہ سے عمدہ مظاہرہ کیا ہے۔

برتر از اندیشۂ سودوزیاں ہے زندگی
ہے کبھی جان اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی

رباعی:۔ رباعی عربی زبان کا لفظ ہے فن شاعری میں رباعی اسے کہتے ہیں جو چار مصرعوں پر مشتمل ہو اسکا پہلا، دوسرا اور چوتھا مصرع ہم قافیہ ہوتا ہے شاعر چوتھا مصرع بہت اہتمام سے کہتا ہے کیوں کہ رباعی کی کامیابی کا انحصار چوتھا مصرع ہی ہوتا ہے۔اس کے اوزان مقرر ہیں۔

غنچے کو نسیم گدگدائے جیسے
مطرب کو ساز چھڑ جائے جیسے
یوں پھوٹ رہی ہے مسکراہٹ کی کرن
مندر میں چراغ جھلملائے جیسے

فراقؔ گورکھپوری

قطعہ:۔ فن شاعری میں رباعی کی طرح قطعہ بھی چار مصرعوں پر مشتمل ہوا کرتا ہے حالانکہ یہ دو مصرعے کا بھی ہوا کرتا ہے غرضکہ قطعہ دو مصرعیہ اور چار مصرعہ کا ہوا کرتا ہے اس میں کسی خاص خیال یا تجربہ کو پوری شدت اور تاثیر وحدت کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔

مسدّس:۔ اردو نظم کا محبوب ترین صنف مسدس ہے اس صنف سخن میں ہر بند چھ مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے پہلے کے چار مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں اس کے بعد دو مصرعے علحدہ قافیوں میں ہوتے ہیں جسے ٹیپ کا شعر کہتے ہیں۔حالیؔ کی مشہور نظم ''مدجزر اسلام'' علامہ اقبالؔ کی مشہور نظمیں اور چکبست نے بھی مُسدّس کے فارم میں نظمیں کہی ہیں جو کافی مقبول ہوئی ہیں۔

حمد:۔ حمد میں اللہ تبارک تعالیٰ کی وحدانیت، قدرت اور ان کی شان اعلیٰ کا ذکر نہایت ہی احترام سے کیا جاتا ہے۔

نعت:۔ نعت سرور کائنات محبوب خدا صافی محشر حضرت محمد ﷺ کی تعریف و توصیف میں کہی گئی نظم نعت ہے اس میں شاعر رسول پاک سے اپنی والہانہ محبت کا اظہار کرتا ہے۔ان کے دامن فیض سے اپنی نجات کی دہائی دیتا ہے اور کار جہاں کے مصائب سے گناہوں سے معافی دلانے کی التجا کرتا ہے نعت میں محمد کی شان میں کہی گئی نظم ہے اس کے لئے اوزان مختش ہیں۔

☆☆☆

اردو افسانہ اور ناول

افسانہ مغربی ادب کی دین ہے یہ ایک جدید صنف ادب کی حیثیت سے انسویں صدی کے آخر کی پیداوار ہے۔ صنعتی انقلاب نے مصروفیات زندگی کو بڑھایا۔ اب لوگوں کے پاس وقت کی کمی ہونے لگی اخبار اور رسائل کی اشاعت نے مختصر وقصے میں تفریح کے سارے سامان اکٹھا کرنے لگے لہٰذا ایک ایسے صنف کی ضرورت محسوس ہوئی جو کم سے کم وقت میں انسانی ذہن کو پوری طرح سرور و محظوظ کر سکے ادیبوں نے ناول ہی کے قصہ کو مختصر کر اس کے صرف ایک حصے کو بیان کرنے لگے جسے مختصر افسانہ کے نام سے جانا جانے لگا۔ اس صنف کی کوئی مکمل تعریف ممکن نہیں کیوں کہ اس میں بہت لوچ ہے اور بدلتی ہوئی زندگی اور زمانے کے ساتھ ساتھ افسانہ کی تکنیک میں بھی تبدیلی رونما ہوتی رہی ہے۔

افسانہ ایک حقیقت پسندانہ صنف ہے انسانی زندگی اور اس کو بہتر بنانے کے لئے سماج اور فطرت کی طاقتوں سے برسر پیکار اس کا موضوع ومحور ہے۔ افسانہ میں اوّل تا آخر قاری کی توجہ قائم رہے دل میں جو کیفیت، یا تاثر ابھرتا ہے اس میں کامیاب ہو اس کے لئے ضروری ہے کہ افسانہ کی بنیاد کسی نفسیاتی حقیقت پر قائم ہو افسانہ میں بیان واقعہ کا اسلوب یا پیش کش ہی اس کی تکنیک کہلاتی ہے افسانہ نگار چاہے واقعہ بیان کرے، بطور راوی یا تماشائی کی حیثیت سے قصہ بیان کرسکتا ہے یا خود اس کا ایک کردار بن جاتا ہے افسانوں میں نفسیاتی حقیقت کے موثر اظہار کے لئے ضروری ہے کہ افسانہ کے فنی لوازم کو مہارت اور تخلیقی حسن کے ساتھ بیان ہونے سے کہانی اور اسکا انداز موضوع کے مطابق ہو۔ افسانہ نگار شروع ہی سے ایسی فضا تخلیق کرے جہاں قاری کو کسی طرح کی اجنبیت کا احساس نہ ہو اور جیسے جیسے وہ مطالعہ کے دور سے گذرے اس کی دلچسپی واستعجاب بڑھتی جائے اور پھر افسانہ اپنے فطری انتہا پر پہنچ کر ایک تاثر اور سبق آموز نقطہ پر ختم ہو جائے۔

افسانہ میں کہانی کہنے کا اسلوب یا انداز بیان ہی اس کی اصل تکنیک ہے۔ خالق جس انداز میں قصہ یا واقعہ بیان کرے اس کے آخر تک وحدت تاثیر قائم رہے دل ودماغ کو ایک ایسے غور فکر پر مجبور کردے جہاں پر وہ پہنچ کر اپنے اندر تبدیلی پیدا کر سکے یہ ماجرہ کے موثر بیان پر منحصر کرتا ہے یہ واقعہ رومانی اور معاشرتی نفسیاتی اصلاحی یا تفریحی ہوسکتا ہے یوں تو افسانہ نگاری کی ابتدا تو محمد حسین آزاد کی نیرنگ خیال سے ہوگئی تھی۔ لیکن زبان وبیان کے اعتبار اور کہانی اور قصہ پن کے اعتبار سے پریم چند نے اردو افسانہ کی ابتدا کی یہ

کہنا غلط نہ ہوگا کہ پریم چند اردو افسانہ کہ موجد بھی ہیں اور موخر بھی ایسا اس لئے کے کسی بھی ادب کے ابتدائی نشو و نما میں جو پریشانی یا کمیاں رہتی ہیں وہ سب پریم چند کے یہاں دیکھنے کو نہیں ملتا ہے موخر اس لئے کہ انہوں نے اردو افسانہ کو اس بلندی تک لے گئے جس سے آگے آج تک کوئی بھی افسانہ نگار نہیں جا سکا۔ ان کے افسانوں میں ہندوستان کی بدلتی ہوئی زندگی اور وطن پرستانہ جذبات کی ترجمانی کی گئی ہے ان کے کردار گرچہ حقیقی ہیں پھر بھی وہ جس ماحول میں سانس لے رہے تھے وہ بڑی حد تک عام انسانوں کی زندگی سے قریب تر ہے ان کے مسائل کی نمائندگی ہے انکا افسانہ۔ ''بڑے گھر کی بیٹی'' ادیب کی عزت، پنچایت اور کفن وغیرہ لاثانی افسانہ ہے۔

پریم چند کے بعد نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھپوری وغیرہ رومانی افسانہ کو فروغ دیا اور ترقی پسند تحریک نے اردو افسانہ میں نئے رجحانات پیدا کئے۔ حقیقت نگاری کا ایک نیا تصویر عام ہوا۔ انہوں نے زندگی کے طبقاتی کردار اور ادب کے سماجی حیثیت پر زور دیا سماجی الجھنو معاشی تلخیوں اور سیاسی چپقلس کے مختلف پہلوؤں پر سے پردہ اٹھایا۔ پسماندہ طبقوں کی حالت زار ان کی سماجی، معاشی اور اقتصادی حیثیت اور ان کا استحصال وغیرہ ایسے جولنت موضوع کے ساتھ ہی اردو افسانوں میں ہندستان کی اجتماعی زندگی کے سارے مسائل کا ذکر آزادی اور بیبا کی سے ہونے لگا غلامی افلاس، جہالت، بھوک، بیکاری، توہم پرستی طبقاتی جنگ ونفرت۔ متوسط طبقہ کی کھوکھلی نمائش کسانوں کی حالت زار، جذباتی اور ذہنی کج روی وغیرہ بے شمار مسائل اردو افسانہ کا موضوع بن گئے۔

آزادی کے بعد اس صنف کا دامن اور وسیع ہوا۔ اردو کے افسانہ نگار عالمی رجحانات سے باخبر ہوا برگساں کا تصور مکاں، فرائڈ یہ خواب، ولیم جس کا چشمہ شعور دوستووسکی کی داخلی ڈرامائیت فرانسی فنکاروں کی علامیت وابہام خیال کے آزاد تلازمے اب اس کے لئے انجانی چیزیں نہ تھیں اسے شعور ولاشعور کے نہاں خانوں سے شناسائی حاصل ہوئی اور اس حقیقت سے آگاہ ہی ہوئی کہ انسانی ذہن میں آباد دنیا خارجی کائنات سے زیادہ وسیع زیادہ تہہ دار اور زیادہ بامعنی ہے اور خوابوں کا میدان اتنا وسیع کہ انسانی تخیل اسکا اندازہ نہیں کر سکتا ہے۔ اردو کے افسانہ نگار گردو پیش آنے والے واقعات سے بھی متاثر ہوا اور عالمی ادب میں رونما ہونے والے رجحانات سے بھی۔

اردو افسانے میں ایک بہت نمایاں فرق یہ ہوا کہ پرانا افسانہ آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے نیا افسانہ کبھی گرفت میں آتا ہے کبھی نہیں آتا بعض جدید افسانے ایسے بھی ہیں جو پوری طرح گرفت میں نہیں آتے مگر ہمیں اپنی گرفت میں لئے رہتے ہیں یہی ان کی کامیابی کی دلیل ہے۔ انہیں پڑھکر ہم ایک تجسس میں مبتلا

ہوجاتے ہیں اور ہمارے ذہن میں ایک طرح کی افراتفری ہوجاتی ہے بعد کے افسانہ نگاروں نے ہیت کے بہت سے پیچیدہ تجربے کئے اور بعضوں نے پوری افسانے کی ریس میں اپنی تکنیک اختیار کی کہ افسانہ عام قاری کے لئے نا قابل فہم ہوگیا۔ ایک عام قاری ان افسانوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے جن میں واقعات تیزی کے ساتھ منطقی ترتیب سے پیش آیئے۔ ان ترتیب کو ایک رخ عطا کرنے والے افسانہ نگاروں میں قرۃ العین حیدر، غلام عباس بلونت سنگھ، شوکت صدیقی، انتظار حسین نے اپنے سجدۂ انہماک اور فکر وشعور سے اردو افسانہ کو تعمیر وترقی کی نئی راہیں دکھائی ہیں۔ انور سجاد، سریندر پرکاش، جوگندر پال، بلراج مین را، غیاث احمد گدی قاضی عبدالستار، جیلانی بانو، راجندر سنگھ اقبال مجید، احمد ہمیش، خالدہ اصغر حسین، کلام حیدری، رتن سنگھ شرون کمار ورما، کمار پاشی، قمر احسن، سلام بن رزاق، احمد یوسف شوکت حیات، حسین الحق شفق، عبدالصمد۔ الیاس احمد گدی، نکہت پروین وغیرہ افسانہ نگاروں نے موضوعات کی وسعت، فکر ونظر کی گہرائی اور فن کے تنوع کے اعتبار ترقی یافتہ صنعت نے عالمی ادب کے فن پارے میں شامل کئے جانے کا مستحق ہے۔

ناول:۔ ناول رومن کا نوویلو انگریزی ناول ایک ایسے نثری قصہ کو کہتے ہیں جس میں زندگی کی مکمل تصویر کشی کی گئی ہو جس میں صنعتی عہد کے پس منظر فرد اور سماج کی کشمکش دکھائی گئی ہو 1857ء کے بعد زندگی کے مختلف گوشوں میں قدیم وجدید، عقلیت اور مذہب مغرب ومشرق کے مابین تصادم کی جو فضا قائم ہوئی اس کے سماج اور وطن میں حالات بنے کہ لوگوں کا ذہن مافوق الفطری عناصر سے ہٹ کر نئے تناظر میں حقیقت کے روبرو ہونے کی کوشش میں داستانوں کے بجائے ناول مغرب کی تقلید میں ڈپٹی نذیر احمد نے اصلاحی ناول لکھنے کا آغاز کیا اس کے اجزائے ترکیبی میں پلاٹ، کردار، مکالمہ، منظر نگاری اور نظریۂ حیات بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ کہانی کی وحدت میں معنوی اور باطنی ربط وتسلسل ہوتا ہے کہ واقعہ سابقہ واقعہ سے لازمی اور منطقی نتیجہ اخز کیا جائے۔

اردو میں ناول نگاری کا آغاز ڈپٹی نذیر احمد کے دست مبارک سے ہوا 1857 کے بعد کا ہندوستانی معاشرہ بالخصوص مسلمان نہایت تنزلی کے دہانے پر تہذیبی اور معاشی بدحالی کا شکار ہوگئی تھی یہ وقت بہت ہی صبر آزما تھا کیونکہ بغاوت سرد کرنے کے بعد انگریزوں نے اسکا واحد سبب انہی لوگوں کو مانا اس لئے عطاب بھی ان ہی لوگوں پر نازل ہونے لگی ایسے موقع پر نذیر احمد نے اصلاح معاشرہ کی خاطر اپنے ناول میں ویسے ہی کہانی کو جگہ دی جس سے قوم کا بھلا ہو۔ مراۃ العروص، بنات النعس، عورتوں کی تعلیم وتربیت پر زور دیا گیا ہے تو بتہ النصوح میں اخلاقی ومذہبی تعلیم کو ناول کا موضوع بنایا ابن الوقت میں معاشرہ کی جیتی جاگتی تصویر ہے ان کے بعد حالؔی سرفراز حسین عزمؔی، سرشارؔ، سجاد حسین، شرر مرزا ہادی رسوا، پریم چندر، نیاز فتح

پوری مجنوں گورکھپوری، راشد الخیری، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر خدیجہ مستور، کرشن چند، راجندر سنگھ بیدی عبداللہ حسین، الیاس احمد گدی انتظار حسین، شوکت صدیقی، کرشن چندر وغیرہ ناول نگاروں نے اردو ناول نگاری کو خوب ترقی دی اور ملک و قوم عہد جدید میں جن مسائل سے دوچار ہو رہا تھا اس کی تصویر نگاری یعنی اصلاح معاشرہ جدوجہد آزادی غربت و فاقہ کشی، سماجی استحصال اور عورتوں کی مظلومیت اردو ناول کے مخصوص موضوع رہے ہیں۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ فنی اعتبار سے ناول ایک مکمل زندگی کا احاطہ کرتا ہے ناول نگار اس کے جزیات پر نظر رکھتا تجسس کو برقرار رکھنے کے لئے قصہ میں انوکھا پن لاتا ہے اس کے برعکس افسانہ زندگی کے کسی ایک واقعہ یا حادثہ کا دلچسپ اور جاذب انداز بیان ہے اردو میں افسانہ کی مانگ اب بھی اس کے میدان اور اس کے امکانات وسیع ہیں یہ مزید توجہ طلب صنف ہے۔

☆☆☆

اردو نظم کا ارتقائی سفر

بحثیت فن کے اردو نظم صنف شاعری کی وہ اصناف سخن ہے جن میں کسی خاص موضوع پر ربط تسلسل کے ساتھ اظہار خیال کیا جاتا ہے قدیم اردو شاعری میں بحثیت فن کے نظم نگاری کا الگ تصور نہیں تھا قصیدہ، مثنوی مرثیہ وغیرہ میں عنوان کے تحت جو شاعری کی جاتی تھی اسے ہم نظم کے زمرے میں رکھ سکتے ہیں کیونکہ متذکرہ اصناف میں عنوان کے تحت اس موضوع کی مناسبت سے ربط و تسلسل کے ساتھ جو باتیں کہی جارہی تھی وہی ابتدائی نظم نگاری کے نقوش ہیں موضوع سے قطع نظر ہیئت یعنی مصرون اور بندوں کی ترتیب کے اعتبار سے زمانہ قدیم میں نظم کی کچھ خاص اسالیب کا رواج تھا۔ مثلاً مسدس، مخمس ترجیع بند میں نظم کے فنی اداب اور اصول اتنے سخت تھے کہ ان میں کسی شاعر کو اصلاح وترمیم کی جرائت نہیں ہوتی تھی اور شاعر روایتی رابطوں کے پابندرہ کر طبع آزمائی کرتے تھے 1857 کے بعد حالات بدلے لوگوں کے سوچنے سمجھنے میں تبدیلی آئی بادشاہت ختم ہوگئی زندگی کے نئے مسائل پیدا ہوئے سیاسی سماجی تعلیمی اور تہذیبی عمل میں تبدیلیوں کی نئی راہیں رونما ہوئیں اور خیالات میں ندرت نے ایک نئے فکر کو جنم دیا نظیر اکبر آبادی نے نظم کی روایت کو انفرادی طور پر اختیار کیا اور نظم نگاری کو عام کرنے کی کوشش میں عام فہم زبان اور روزمرہ کے الفاظ استعمال کیا۔ انہوں نے اپنی نظموں میں جگہ دیگر ویسے الفاظ کو زندہ کردیا جو متروک ہو چکے تھے اردو نظم کی تاریخ نظر اکبر آبادی کے ذکر کے بغیر ادھوری اور نامکمل ہے۔ نظیر نے بلاتفریق وامتیاز مسلم ہندو کے پرب تہواروں پر عمدہ اور مثالی نظمیں لکھ کر اردو زبان کی گنگا جمنی تہذیب کی مثال پیش کیا ہے "برسات"، "ہولی"، "دوالی" وغیرہ مذہبی روایت کی عمدہ مثال ہے ہم اسے اردو نظم کا پہلا پڑاؤ کہیں گے دوسرا پڑاؤ جنگ آزادی کی پہلی لڑائی کے بعد کا جہاں بقول شاعر۔

صدسالہ دور تھا ساغر کا ایک دور
نکلے جو مئے کدے سے تو دنیا بدل گئی

شاؔد

ہندوستان کی دنیا ہی بدل گئی تھی ایسے نامساعت حالات میں سید احمد خان کی اصلاحی کوششوں نے تہذیبی اور شقافتی طور پر کچھ راحت دلانے میں کامیاب ہوئی تو شاعری میں حالؔی نے نیچرل شاعری کی طرف لوگوں کا ذہن راغب کرانے کی کوشش کرنے لگے اسی کوشش میں کرنل ہالرائڈ اور محمد حسین آزاد نے

لاہور میں 1874ء میں انجمن پنجاب قائم کیا اور اس انجمن کے زیر اہتمام ہر مہینے مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ اس انجمن اور مشاعروں کی خوبی یہ تھی کہ مصرعے طرح دیکر غزل نہیں کہی گئی بلکہ عنوان کے تحت نظم لکھی گئی اور سنائی گئی۔ غرضکہ اردو نظم نگاری کے سفر میں محمد حسین آزاد اور انکے رفقاء کا انجمن دوسرا پڑاؤ ہے جہاں سے نظم نگاری کی ایک نئی روایت کی بنیاد پڑی نظم "مدجز اسلام" اسی کا نتیجہ ہے نظم نگاری کا میدان کھلا اور بہت وسیع ملا جہاں شاعروں کے افکار بلا جھجھک بغیر کسی امتیاز کے اصل صورت میں باہر نکلنے لگے اور ادب میں ایک بہت بڑا ذخیرہ نظموں کا جمع ہو گیا۔ موضوع یا نفس خیالی کے اعتبار سے ان نظموں میں زندگی کے مسائل جذبات و خیالات کی وسعت اور احساسات کی ترجمانی کی جانے لگی حالی نے برکھارت، نشاط امید، حب وطن اور مناظرہ رحم وانصاف کے عنوان سے جو نظمیں پڑھی ان کی ظاہری ہیئت گرچہ مثنوی کی ہے لیکن ان میں زندگی کے بارے میں ایک نیا رویہ، خیالات کی ایک نئی ترتیب اور نظم کی تعمیر کا یک نیا شعور جھلکتا ہے اس سفر کے شرکاء میں محمد حسین آزاد، حالی اسمٰعیل میرٹھی نظم طباطبائی وغیرہ شاعروں نے انگریزی نظموں کے ترجمے اور اردو نظم نگاری کے بندھے ٹکے موضوعات کے دائرے سے نکال کر تجربات ومشاہدات کے اظہار کے لئے ایک کھلے وسیع وعریض میدان میں پرواز کے لئے چھوڑ دیا۔

رسالہ "مخزن" نے نظم کی جدید طرز کی رہنمائی میں شعراء اکرام کا تخلیقات شائع کر قارین کو نظم کے ذوق اور اسالب کی ندرت سے واقف کرایا اس میں علامہ اقبال سرور جہاں آبادی، تلوک چند محروم وغیرہ نے اپنی اپنی شہرہ آفاق تخلیق سے آفاقی ہو گئے موضوع اور فن کے اعتبار سے اردو نظم نگاری کو نئی وسعتوں سے روشناس کیا۔ علامہ اقبال کی ابتدائی نظمیں ان کے مجموعہ کلام 'بانگ درا' میں شامل نظمیں، ہمالہ، شمع، پروانہ ایک آرزو شعاع امید' شکوہ' جواب شکوہ' میں اردو نظم کی کلاسیکی روایت خصوصاً نظیر اکبرآبادی کے اسالیب فن سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وطن پرستی کے جذبہ کو معراج کمال تک پہنچا دیا جب اقبال نے اپنی نظم "ترانہ ہندی" میں کہا۔ ؎

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

اقبال کے زمانے میں شبلی نعمانی اور چکبست نے بھی سیاسی مسائل پر اپنی قیمتی آرا کا اظہار کیا ہے بیسویں صدی کے نصف اول تک اردو نظم کے کارواں میں شریک شعراء نے سیاسی بیداری' قومی وملی جذبات کا برملا اظہار غلامی کی زنجیر کو اکھاڑ پھینکنے کی جدوجہد اور وطن کی عزت وآبرو کی حفاظت میں خون کا آخری قطرہ تک نچھاور کر دینے کا جوش وجذبہ اس تیزی سے زور پکڑا کہ اہل وطن والوں کی خواب غفلت سے بیداری کی مہم کا

غلبہ اس قدر بڑھایا کہ فرنگی کو ملک چھوڑ کر جانا ہی پڑا۔ اس سفر میں آزادی و جمہوریت، سماجی انصاف فن وادب اور عشق ومحبت کے نئے تصورات نے ایک نیا ذہن نیا احساس نیا شعور بیدار ہوا۔ اس سفر کے نمائندہ شاعروں میں شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی، سیماب اکبرآبادی، حفیظ جالندھری ساغر نظامی احسان دانش، جمیل مظہری وغیرہ نئے قومی وملی نظموں کے ذریعہ ایک متحد ہندوستان کا خواب دیکھ رہے تھے۔ لیکن ہوا اس کے برعکس۔ آزادی تو ملی لیکن وہ خون آلود آزادی تھی پورے ہندستان میں فساد بھوٹ پڑا تھا بے دریغ معصوم بچوں اور عورتوں کی عصمت کی دھجیاں اڑائی جارہی تھیں ہندستان کا ایک ٹکڑا الگ ہو چکا تھا تقسیم ہنداور فسادات کا بہت برے اثرات اہل وطن پر مرتب ہوئے نا فراموش کردہ سانحہ کو شاعروں نے بہت گہرائی سے اثرات قبول کیا اوراس کی چھوٹی چھوٹی اشاب کو بھی اپنی نظموں کے ذریعہ خون کے آنسو روئے اوراس درد کا سانحہ ان لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کی جو طبقہ اس کا ذمہ دار تھا۔ آزادی کی جشن کو جس میں لاکھوں بے گناہوں معصوموں کے خون لرزاں تھے فیض نے کہا۔

یہ داغ داغ اجلا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

اس دور میں اردو نظم ایک کرب سے گزر رہی تھی قومی وملی سرمایہ تباہ و برباد ہو کر رہ گیا تھا۔ سماج میں کشیدگی نے دو قوموں کے درمیان نفرت اور ایک دوسرے کو مشکوک بنادیا تھا۔ اعتماد و بھروسہ اٹھ گیا تھا۔ وہ راست گوئی۔ مساوات اور یکجہتی کو زبردست دھچکا لگا تھا ایک طرف قومی زندگی کی کروٹوں اور دوسری طرف فرد کے بدلتے ہوئے کردار کی آئینہ دار بن گئی تو عبدالرحمن بجنوری، عظمت اللہ خاں، اختر شیرانی، اور ڈاکٹر تاثیر وغیرہ نے خلیج کو پاٹنے کی کوشش شروع کردی اور نظم میں جذبۂ احساس اور نئے شعری تجربات کے ذریعہ گذرے ہوئے دکھوں کو بھول کر نئے سرے سے زندگی کا آغاز کرنے کا صلاح ومشورہ دینے لگے۔ اس کے علاوہ ان لوگوں نے ہندوستانی تہذیب کے جلوہ صد رنگ کو ترجمان بنایا ناگری کے عام فہم الفاظ کو استعمال کرانفرادی رنگ دیا۔ اختر شیرانی نے بحر کی پابندیوں کے ساتھ ہیئت کے کامیاب تجربے کئے اور اردو والوں کو سانٹ سے روبرو کروایا۔

ترقی پسند تحریک سے متاثر شعراء نے اردو نظم کے موضوعات اور ہیئت کے مزاج میں خوش گوار تبدیلیاں لاکر زندگی کی طبقاتی بصیرت اور انسان دوستی کا ایک نیا اور صحت مند تصور پیش کیا وطنی آزادی کا ایک نیا آدرش اور محنت کش عوام کی آفاقی بیداری کو ایک نیا عزم دیا۔ علامہ اقبالؔ اور جوشؔ نے اردو نظم کو اس لائق بنادیا کہ زندگی کے فلسفیانہ مسائل اور سماجی تجربات پیش کر سکے چنانچہ ترقی پسند شعراء نے نظم کے

ذریعہ اپنے عہد کی پرآسوب اور گونا گوں مسائل سے روشناس کرایا اس سرمائیہ احساس کو صفحہ قرطاس پر لانے میں مجاز، کیفی، فیض، جذبی، سردار جعفری، مخدوم محی الدین، جاں نثار اختر علی جواد زیدی اور ساحر لدھیانوی نے اپنے عہد کی سیاسی اور سماجی زندگی کی ہنگامہ آرائیوں اور ان سے پیدا ہونے والی ذہنی اور جذباتی فضا کو موضوع بنا کر نظم کے معنی و خیال میں تازہ دم صبح نو کی خوش آئند آمد کی نشان دی کی۔ دوسرے ترقی پسند شعراء جنہوں نے نظم کی ہیت میں تبدیلی لائی اور دنیا میں رونما ہونے والے واقعات سے متاثر ہوکر بالخصوص مارکس کے فلسفیانہ محرکات کو اپنا کر اردو نظم میں تجربے کئے ان میں میراجی، ن م راشد، اختر الایمان اور سلام مچھلی شہری قابل ذکر ہیں۔ ان لوگوں نے نئے تجربے کے ساتھ مواد۔ ہیت اور تکنیک کی تعمیری وحدت کو اردو نظم کو نئے انداز و آہنگ سے متعارف کرایا۔

اردو نظم کا سفر بڑھتا ہوا اکیسویں صدی میں داخل ہوا تو شاعروں نے محسوس کیا کہ دنیا بدل گئی ہے ضروریات زندگی اس تیز رفتاری سے اپنے آغوش حرب میں لے چکی ہے کہ بغیر اس کے ایک عام زندگی کا تصور محال ہے الکٹرونک انقلاب نے ہر چیز کو برسوں کی مسافت کو پلک جھپکتے حل کر رہی تھی۔ ان حالات سے پہلے پہل شاعروں نے اثرات قبول کئے اور جدید ترین امکانات کے ساتھ تجربات کی بھٹی میں کود پڑے وہاں سے جو لعل و گہر نکال کر لائے اسے اپنے قارئین میں تقسیم کرنے لگے۔ ان میں ذاہد ڈار، انیس ناگی قاضی سلیم، سلیم الرحمٰن، افتخار جالب، جیلانی کامران، شہریار ابن انشاء، وحید اختر، شمس الرحمٰن فاروقی، شکیب نیازی آشفہ چنگیزی، شمیم انور، وغیرہ شاعروں نے کہے تناظر میں نئے افکار سے اردو نظم کو روشناس کرایا ہے۔ ان لوگوں کے یہاں جدید ترین ایجادات کے مصفی اور منفی امکانات کو شدت کے ساتھ محسوس کیا ہے یہی وجہ ہے کہ اس دور کے نظم نگاروں کے یہاں احتجاج اور جھلاہٹ کی لئے بڑھی ہے۔ اشیاء سے براہ راست واسطہ اور واضح اظہار کی سمت میں پیش قدمی ہوئی ہے۔ ان لوگوں کو لفظ کے صوتیاتی اور معنیاتی قدروں کا گہرا خیال ہے۔

بحثیت مجموعی دیکھا جائے تو اردو نظم کا سفر اکیسویں صدی کے شروعات تک نظم نگار و شعراء اپنی علیحدہ پہچان بنانے میں مصروف ہیں بعض اچھی تخلیقات سامنے آئیں ہیں اردو نظم کا مستقبل روشن اور تابناک ہے۔

اردو ڈراما

اردو میں ڈراما انگریزی لفظ ڈراما کو بغیر کسی ردو بدل کے اختیار کرلیا گیا ہے۔ بحیثیت فن کے ڈراما اس صنف کو کہا جاتا ہے جس میں قصّے کو کردار کے ذریعہ اسٹیج پر کر کے دکھایا جائے انگریزی میں اسے A theatrical entertenment play کہتے ہیں فنی اعتبار سے پلاٹ ،کردار نگاری ،مکالمہ، کشمکش ،منظر نگاری اور حسب حال اسٹیج کا ہونا ضروری ہے۔ ڈرامہ زندگی کی عکاسی کا نام ہے یہ لطیفہ کے قدیم ترین شکلوں میں سے ہے۔اس کی ابتداء ہندوستان میں قبل مسیح کے سنسکرت کے ناٹک اور یونان میں ڈراما لگ بھگ ایک ساتھ ہی ہوئی ہے ڈراما جیسا کے مفکروں نے لکھا ہے کہ یہ نقالی ہے اور قدیم فنون لطیفہ کی ایک اہم کڑی ممکن ہے کہ زمانہ قدیم میں تفریح کا کوئی انتظام نہیں تھا تو لوگ دل بستگی کی خاطر روز و شب کے مشاہدوں پر مبنی کسی ایک واقعہ کو مرچ مسالہ لگا کر بیان کرتے تھے اس میں رزمیہ رومانیہ اور نشاطیہ پہلو زیادہ دلچسپ ہوا کرتے تھے پھر اس میں جذبیہ اور رجز شامل ہوئے اس دور میں ایسے واقعہ کو بھی نقال بیان کیا کرتے تھے جس میں اس کے قبیلہ کا کوئی سردار اپنی بہادری کا بے مثال کارنامہ انجام دیا ہو یا محبت کی اماج گاہ میں ناکامی اور حسرت ناک خاتمہ کی نقالی کرتا تھا۔

ڈراما میں الفاظ کی صنعت گری کے ساتھ ساتھ انداز پیش کش بھی اہم مقام رکھتا ہے بعض نفسیاتی کیفیات کے ردعمل کے طور پر انسان کے رویہ اور مزاج میں تغرات ہوتے ہیں اور یہ عمل جسمانہ ذہنی اور جذباتی بھی ہوسکتا ہے۔ کردار مکالمے اور عمل کے ذریعہ قصہ کو پر تاثر انداز میں پیش کرنا ڈراما کی کامیابی کا انحصار ہے۔ ڈرامہ ایک ایسا فن ہے جس میں زندگی کے حقائق ومظاہر کو پیش کیا جاتا ہے۔ ڈراما کے قصہ کو دلچسپ بنانے کے لئے حرف بہ حرف حقیقت پر مبنی نہیں ہوتا بلکہ قصے کا صرف اصل پہلو ہی لیا جاتا ہے باقی ڈراما نگار اپنی لیاقت اور تجربہ کے ذریعہ اس میں رنگ وروغن بھر کر دلچسپ اور جاذب بناتا ہے ڈرامے کا فن بعض مخصوص تقاضوں کا حامل ہوتا ہے اس میں واقعات کی کڑیاں ملانے کے لئے ڈرامہ نگار قصہ کو آگے بڑھانے کے لئے کردار اور مکالموں کے ذریعہ ہی واقعات کی رفتار کو زندہ رکھتا ہے۔ پھر واقعات اور مناظر کو پیش کرنے کے لئے مناسب اسٹیج کا اہتمام کیا جاتا ہے اور وہی واقعات ومناظر پیش کئے جاسکتے ہیں جو اسٹیج پر دکھایا جاسکے۔ واقعات کے تسلسل میں دلکشی ودلچسپی برقرار رکھنے کی خاطر حسب حال طریقہ اختیار کرتے ہیں جو اسٹیج پر ممکن ہوا اور اس کی طوالت کا بھی خیال رکھا جاتا ہے کہیں سامعین کو بار نہ معلوم ہو کل واقعات کو

معین وقت پر ختم کر دینا چاہئے۔ ڈراما میں اختصار معنویت میں گہرائی اور تاثر میں اضافہ کر دیتی ہے۔

ڈرامہ نگار اپنے مقصد کو پیش کرنے کے لئے کرداروں اور مکالموں کے ذریعہ مقصد کی حصولیابی کرتا ہے وہ سماج کے جس مسئلہ یا زندگی کی جس سچائی کا انکشاف کرنا چاہتا ہے اس کے لئے کرداروں کی حسب حال تعمیر اور مکالمے کی برجستگی میں اس طرح داخل کر دیتا ہے کہ سامعین کو اس بات کا احساس تک نہیں ہوتا کہ وہ غیر محسوس طور پر ڈرامہ نگار کے نقطہ نظر سے متاثر ہو رہا ہے قصہ کردار کے ذہنی ارتقاشات۔ قلبی واردات اور اس کے افعال واعمال سے مرتب ہوتا ہے قصہ کے واقعات جب ایک بامعنی اور باطنی ربط و آہنگ اور نظری تسلسل کے ساتھ تکمیل کو پہنچتا ہے۔ یہ واقعہ یا قصہ ایک منطقی تسلسل کے ساتھ دلچسپی قائم رکھتا ہے۔ الغرض کہ واقعات یا قصہ ڈراما کی ریڑھ ہے ان قصوں کو مکالموں کے ذریعہ کردار عمل کرتا ہے اور اسٹیج کی آرائش مناظر کا عکس اور اداکار کی حسن ادا ہی سامعین کو متاثر کرتا ہے۔ ڈراما میں مکالمہ کی اہمیت بھی اہم اور مؤثر ہوتا ہے مکالمہ جتنا چھوٹا حسب حال اور جامع ہوگا ادائیگی میں بھی سہولت اور تماشبین کی سمجھ میں بھی آسانی ہوتی ہے مکالمہ مختصر جاذب اور چست ہونا چاہئے تا کہ کردار کم سے کم وقت میں ادا کرے اور اسکا ردعمل بھی اسے مل جائے ایک کامیاب ڈرامہ کے لئے چست درست مکالمہ کردار اپنی گفتگو اور عمل سے اپنی سیرت کا اظہار اور اس کے مواقع فراہم کرتے تا کہ باہمی کشمکش کی خصوصیات اچھی طرح واضح ہو جائے یہی ڈرامہ نگار کا کمال ہے۔ مکالمہ اپنی اہمیت کے اعتبار سے ڈراما کی روح ہوتا ہے یہ بات چسیت کے ذریعہ احساسات کی جھلکیاں دکھاتا ہے۔ مکالمے میں کردار کی شخصیت کی اصل کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے یہ نہ صرف واقعات کو آگے بڑھاتا ہے بلکہ وہ کہانی کو بھی متوازی طور پر بڑھاتا ہے اس لحاظ سے اسکا بہت اہم رول رہتا ہے کیونکہ پلاٹ کی تسکیل، سیرت اور مقصد کو موثر طریقے سے پیش کرنے میں ڈراما نگار کا معاون و مددگار ہوتا ہے۔ ڈراما عام انسانی زندگی سے قریب ہوتا ہے یا یوں کہیں کہ انسان زندگی کے ابھرتے ہوئے مسائل کی نقالی کرتا ہے۔

عام طور پر ڈراما کو دو خانوں میں رکھا گیا ہے ایک کو رزمیہ یا المیہ ڈراما کہتے ہیں تو دوسرے کو طربیہ۔ المیہ یا رزمیہ ڈرامہ میں کسی جنگ میں لڑتے ہوئے شہید ہو جانے پر اس کی بہادری کے قصے نثر، نظم کی صورت میں بیان کئے جاتے ہیں جس سے ملک وقوم اور فرقہ کو اس کی زندگی پر فخر و ناز کا احساس ہوتا ہے اس کا ذکر نہایت ہی احترام اور عقیدت سے کرتے ہیں اس میں شروع سے آخر تک مسرت و انبساط کا فقدان ہوتا ہے اسے ٹریجڈی سے زندگی پر کہیں مثبت کہیں منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ایسے ڈرامہ اعلیٰ فنی صلاحتوں اور مناسب فکر سے بھرا ہوتا ہے۔ یہ مصائب اور شدید ہم آہنگی جذبات کی تصویر کشی کر کے تماشبین کے دل میں ہمدردی پیدا کر دیتا ہے۔ جس سے ڈرامہ نگار کی صلاحیت نمایاں ہوتی ہے۔ اس طرح کا ڈرامہ

مغرب میں اور سنسکرت میں ملتے ہیں اردو ڈراما ایسے جذبات کو متاثر کرنے والے کوائف سے مبرا تھے۔

طربیہ ڈراما فرحت، مسرت، انساط اور ظرافت پر مبنی ہے اس کے اثرات طمانیت بخش اور خوش کن ہوتے ہیں اس میں انسانی زندگی کو اس کے ذاتی کوائف ومصائب سے نکال کر نشاط وظرافت کے کے ذریعہ مضمحل مغموم دل کو پر مسّرت بناتا ہے اور ظرافت کے ایسے ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے کہ تماشبین قہقہا لگانے اور تالیاں بجانے لگتا ہے۔ زندگی سے مایوس شخص کچھ دیر کے لئے ہی صحیح خوش ہو کر زیرلب مسکرانے پر مجبور ہو جاتا ہے یہ سب اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب ڈرامہ نگار چست درست ظریفانہ مکالمے کے ذریعہ ماحول کی فضا کو بدل دے اور روتا ہوا آدمی ہنسنے لگے یہ تماشائی یا سامعین پر ایسا اثر مرتب کرتا ہے کہ اسکا ذہن مسرور کن ہو جاتا ہے اسمیں اخلاقی قدروں اور شرافت نفس پر زور دے اور ایسا سکون مرتب کرے کہ روح کو ایک ابدی سرور حاصل ہو یہ ظرافت مکالمہ کے ذریعہ کردار اس حسن سلوک کے ساتھ ادا کرے کہ ظرافت کا رنگ دوبالا ہو جائے۔

ڈراما کی تاریخ میں One act play Drame کا وجود عمل میں آیا اس کی خاص وجہ یہ رہی کہ آزادی کے بعد صنعتی ترقی نے لوگوں کی ضرورت سے زیادہ مصروف کر دیا لیکن مسرت کی ضرورتیں حسب حال قائم رہی تو فنکاروں نے وقت کا لحاظ کرتے ہوئے یک بابی ڈرامہ کی بنیاد رکھی اس کے کئی اور اشباب بھی تھے اوّل الذکر یہ کہ ڈراما اسٹیج کی جگہ فلموں کی چمک دمک نے لے لی۔ دوسری وجہ ریڈیاں ڈرامہ نے مختصر وقفہ میں مکالمہ کے ذریعہ ایک پر تاثراتی ڈرامہ نے جگہ لے لیا۔ اس طرح ڈرامہ اسٹیج کرنے کی جو دشواریاں یا اس کی تیاریوں میں جو وقت لگتا تھا پھر وقت کی تنگی نے ہال کو خالی رکھنے کی روش فنکاروں کے ذہن کو مختصر کرنے پر مجبور کر دیا اور ڈرامہ نگار مختصر اور جامع الفاظ کے ذریعہ یک بابی ڈراما میں ضروری اشیاء کا اہتمام کرنے لگے۔

اردو میں ڈراما نگاری کی تاریخ زیادہ طویل نہیں ہے کیوں کہ ادب میں مذہب کا رنگ ہمیشہ سے موجود رہا ہے اور نقالی شجر ممنوعہ کی مانند مستعمل تھا۔ اس بندش کو نواب واجد علی شاہ کا ڈرامہ ''رادھا کنھیا'' نے توڑا اور خود ڈرامہ لکھ کر اسے عمدہ ساز وسامان کے ساتھ محل میں اسٹیج کیا گیا۔ یہ ڈرامہ کافی مقبول ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ ڈراما کے اسٹیج کرنے تک اس میں لاکھوں کا خرچ آیا تھا صرف کنھیا کے تاج میں لاکھوں خرچ ہوئے تھے۔ بہر کیف واجد علی نے اردو میں ڈرامہ نگاری کے فن سے روش ناش کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لکھنؤ میں ڈرامہ کا ذوق عام ہو گیا۔ اور امانت لکھنوی نے ''اندر سبھا'' جیسی بے مثل تمثیلی ڈرامہ تخلیق کی۔ ''اندر سبھا'' عہد واجد علی شاہ میں شہرت کی بلندیوں کو چھو لیا۔ اس کی ہمہ گیر شہرت میں

بان کی صفائی، شیرین اور شاعرانہ حسن میں مضمر ہے۔ امانت لکھنوی نے رقص و موسیقی اور نغمہ و سرور اور
نداز پیش کش نے دوام بخشا۔ اس کی تشکیل میں ہندستانی و ایرانی دیو مالاؤں کا لطیف امتزاج اور ہندی و
ردو کے باہم تفاوت نے عوامی مقبولیت حاصل کی یہ قصہ راجا اندر کے دربار سے متعلق ہے اس میں سبز
پری اور شہزادہ گلفام کی محبت کی کہانی ہے۔ اس کے بعد مداری لال کی "اندر سبھا بھی کافی مشہور ہوئی۔

اردو ڈرامہ کی تاریخ میں بمبئی تھیٹر نے اہم رول نبھایا ہے اس تھیٹر سے ڈاکٹر لاڈ نے "راجا گوپی چند اور جالندھر" اسٹیج کیا جو کافی مشہور ہوا۔ پارسیوں نے بھی اردو ڈراموں کو فروغ دیا اس میں نیم حکیم اور قتل عام" اور واجد علی شاہ کا ڈرامہ "رادھا کنھیا" نے اردو ڈرامہ کو ہمہ گیری بخشی اس کے بعد بمبئی میں کئی تھیٹر کمپنیاں قائم ہوگئی اور ڈراما نگاروں میں احسن لکھنوی رونق بنارسی طالب بیتاب وغیرہ نے قابل ذکر ڈرامہ لکھ کر اردو ادب میں ڈرامہ کے ذخیرہ میں اضافہ کیا۔ اردو ڈراما کی تاریخ میں آغا حشر کاشمیری کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ امتیاز علی تاج کا "انارکلی" عابد حسین کا "پردہ غفلت" اپندر ناتھ اشک' کرشن چندر سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، خواجہ احمد عباس، پروفیسر مجیب، راجند سنگھ بیدی اور فضل الرحمن وغیرہ نے ڈرامے کو ہندوستان کی قومی زندگی سماجی و معاشی مسائل کو ترجمان بنایا اور انکی فنی تصانیف نے دلکشی اور معنوی گہرائی کے اعتبار سے ڈرامہ کی سطح کو بلند کیا ہے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اردو ڈرامہ کے ارتقائی سفر میں گوناگوں مشکلات کے باوجود کافی ترقی کی ہے۔

اردو ظرافت

ظرافت کوانگریزی میں Wit یا Humor کہتے ہیں ظرافت کثیرالمعنی لفظ ہے۔خوش طبعی، بزلہ سنجی، ہنسی، قہقہہ، ٹھٹھول، پھکڑ بازی مزاح، مذاق، لطیفہ وغیرہ ایسے بہت سے متبادل الفاظ ہیں جوادبی اور غیر ادبی زبان میں مستعمل ہے موقع و مصلحت کی مناسبت سے کسی بات کومزاح کی چاشنی اور عمدہ لطیف پیرائے انداز بیان میں لطافت شگفتگی خوش مزاجی اورادائیگی میں ایسی لچک ہو کہ جملے یا شعر کا سننے والا بے اختیار ہو کہ ہنس پڑے ظرافت قلم کار کی فطرت یا طبع کی ایک خصوصیت ہے یہ نثر وشعری تحریروں کے ذریعہ پیش کیا جاتا ہے ظرافت ظریف کے سیرت کا خمیر ہے اور یہی اس کے قلم کا رطب وافشاں زندہ دلی خوش طبعی شگفتہ بیانی میں طربنا کی ہوتی ہے شوخ اور چنچلے رنگ میں زعفران زاوز مین میں ہنسنے اور ہنسانے کے خوب مواقع میسر آتے ہیں دوسروں پر ہنسنا بہت آسان اور عام بات ہے مگر اپنے پر دوسروں کو ہنسانا بہت مشکل اور دشوار ہوتا ہے لیکن جوشخص اپنی معصومیت اورلفظوں کی نزاکت کوتوڑمروڑ کر احمقانہ انداز سے پیش کرنا ہی ظرافت کی عمدہ مثال ہے ۔ظرافت میں دوسروں کی حماقت کا ذکر احمقانہ انداز میں پیش کرنے کے فن میں مہارت ہی دلی مسرت دلاتی ہے ظرافت کے لئے خیالات میں نا مطابقت قائم کرنے سے واقعات کے بیان میں تجسس کے ساتھ خاتمہ بالکل غیرفطری طریقہ پر ہو یا احمقانہ ہونے سے ہنسی فوراً چھوٹنے لگتے ہیں۔

ظرافت کا حسن اختصار میں ہے ظریف اپنے مخصوص طرز بیان سے ماحول کو زعفران زار بنا سکتا ہے اس فن کے لئے ظریف کی ذہانت حاضر جوابی اور بے ساختگی سے حاضرین کوقہقہہ لگانے پر مجبور کرسکتا ہے ظرافت کی تاریخ بہت قدیم ہے اسکا فن دربارشاہی یا راجہ ونواب کے یہاں پروان چڑھا۔اس کے کئی وجوہات رہے ہیں اوّل تو ان کے پاس وقت بہت ہوا کرتا تھا دوئم یہ کہ امورسلطنت وریاست کی پریشان کن مسائل سے ہٹ کر کچھ دیر کے لئے خود کو الجھنو و پریشانیوں سے الگ ہوکر دلبستگی کی خاطر خوش طبعی کے لئے دربار میں کچھ لرگ اس فن کے ماہر رہا کرتے تھے جو بادشاہ وقت کی دل بستگی کر کے اسے غموں دکھوں اور الجھنوں کی دنیا سے آزاد کر بزم نشاط میں داخل کردے ایسے لوگ محفل کی جان ہوا کرتے ہیں دربار اکبری میں بربل اور ملاّ دو پیازہ بادشاہ کے نورتنوں میں شمار کئے جاتے تھے۔

اردو ادب میں یہ فن فارسی سے منتقل ہوا ہے اردو شاعری وادب کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں

اردو کا شاعر آدم کہلانے والا شخص حضرات امیر خسرو کے کلام میں ظرافت کا پہلو ہر جگہ نمایاں ہے بلکہ ان کی شاعری کا ایک بڑا حصہ ان فنون پر منحصر ہے۔

ظریف تھکے ہارے حکمراں کو اپنے باغ و بہار لطائف کے ذریعہ تازہ دم کر دیتے تھے۔ زمانہ قدیم میں افواج کے ہمراہ بھی کچھ لوگ اس صفت کے رہا کرتے تھے جو اپنے ظریفانہ بیان سے خوش کرتے اور دشمن پر حملہ کے لئے جوش دلاتے تھے ابتداء میں ظرافت کا فن بہت ہی مہذب طریقے سے الفاظ کے انداز بیان اور واقعات کے بیان میں مزاح پیدا کر لوگوں کا دل بہلایا کرتے تھے اس فن میں لوگ ایک دوسرے پر سبقت لئے جانے کی ہوڑ نے معیار سے نیچے گر گئے اور ایسے ایسے جملے وفقرے استعمال کر لطف پیدا کرنے لگے جو غیر معیاری اور غیر مہذب ہوا کرتا تھا ظرفاء کی کثرت نے اس فن کو اس سطح سے بہت پست کر دیا عام اور سستے مزاق پھکڑ، ٹھٹھول اور ابتذال کی آزادی سے ظریف کو مسخرہ، بھانڈ اور ظرافت کے فن کو کشیفہ بنا دیا ورنہ ظریف نہایت ہی مہذب تجربہ کار اور ماہر فن ہوا کرتا تھا جس کی ذکاوت ذہانت، علمیت اور دانش مندی حاضر جوابی اور بذلہ سنجی سے محترم ہوا کرتا تھا یہ اتالیق، نگراں یا مشیر کار ہوا کرتے تھے۔

اردو ادب میں ظرافت کی چاشنی سے کم و بیش ہر شاعر مستفیض ہوئے ہیں۔ میر تقی میر، انشاء اللہ خاں انشاء نے اپنے کلام میں ظرافت کے لطف سے خود بھی محظوظ ہوئے اور دوسروں کو بھی محظوظ کیا کہا جاتا ہے کہ اردو ادب میں ظرافت کو ایک اعلیٰ مقام پر لانے میں غالب نے اہم رول ادا کیا ہے۔ الطاف حسین حالی نے ''یادگار غالب'' میں غالب کی ظرافت کے لئے ایک باب متعین کیا ہے اور اس میں غالب کو حیوان ظریف کہا۔ غالب کے بعد تقریباً سبھی شعراء نے اپنے کلام میں ظرافت لانے کی کوشش کی اردو کے شعراء کرام نے ظرافت میں نہ صرف یہ کہ صرف ظرافت ہے بلکہ ظرافت کے پس پردہ سماج کی برائیوں کو مزاحیہ انداز بیان میں لوگوں کو متنبہ کرنے کی کوشش کی ہے اس کے بعد اردو ادب میں ظرافت کی اہمیت بڑھ گئی اور لکھنؤ سے ''پیام یار'' اور ''پیار'' شائع ہوا اس میں مزاحیہ شاعری کو خاص جگہ، مقام اور افضلیت کے ساتھ شائع کیا جانے لگا اس سے اس فن میں ترقی ہونے لگی قنوج سے ''عاشق'' نام کا گلدستہ شائع ہوا جو ظریفانہ شاعری کے لئے مخصوص تھا۔ اسی طرح ''فتنہ'' اودھ پنچ'' اور اپنچ ''اخبار نثر و نظم دونوں شعبہ میں ظرافت کی تخلیق ہونے لگی اور لوگوں کے درمیان ظرافت کے چٹخارے سے زبان تازہ دم ہو کر دل و دماغ کو آفات زندگی سے مسرت و انبساط کی وادی کا سیر کرانے میں معاون و مددگار ہونے لگے۔

زمانہ بدلہ حالات بدلے لوگوں کے غور و فکر کا طریقہ بدلا صنعتی ترقی نے لوگوں کے اوقات میں کمی لائی اور مصروفیت بڑھنے لگی روزگار کے وسائل بڑھے تو ادب بھی متاثر ہوئی اور شاعری کی طرح

ظرافت کا فن بھی دربار سے نکل کر عام محفلوں کی زینت بننے لگی جمہوریت نے شخصی آزادی کو ترجیح دی جس کے دامن میں ظرافت نے دربار شاہی اور نوابی کی جگہ کتب و رسائل نے پناہ دیا اور جدید دور میں رسالوں ،مشاعروں، ٹی وی اسٹیج کے ذریعہ اور ریڈیو نشریات کے ذریعہ بھی ظرافت کو عوام تک پہنچانے کا ذریعہ تسلیم کیا گیا۔ اب ظرافت نثر و نظم دونوں کے ذریعہ پیش کیا جانے لگا اسمیں لطیفہ کو خاص اہمیت حاصل ہے اردو ادب میں ملاّ نصرالدین کے مزاحیہ کردار کو شیخ چلّی کی شکل میں پیش کرنے لگے۔ مزاحیہ شاعری کا ایک باب کی شروعات ہونے لگی اور ہر بڑے و چھوٹے مشاعرے کی کامیابی مزاحیہ شاعری یا ظریفانہ شاعری پر منحصر ہونے لگی ہے۔ اردو ادب میں اب تک کوئی ایسا مزاحیہ کردار ابھر کر سامنے نہیں آیا ہے جس کے محض تصور سے ہی ذہن کے ترنگ بجنے لگیں اور کبھی زیرلب تو کبھی کھل کر ہنسنے لگیں۔ ایسے تصوراتی مزاح کے لئے تو شاعروں اور ادیبوں نے کئی کردار اختراع کئے ہیں لیکن ان کرداروں میں وہ کشش یا بے ساختہ پن پیدا نہیں ہوا ہے جو ملاّ نصیرالدین کے محض تصور سے ہی ذہن میں ظرافت کے تار بجنے لگتے ہیں اردو میں اس کا متبادل شیخ چلّی ،ملاّ جی، پنڈت جی، لال بجھکو، شیخ جی، افیم چی، میاں خوجی اور سردار جی وغیرہ کے پردے میں سماج کی خامیوں پر طنز کے ساتھ ساتھ ظرافت پیدا کرنے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔

اردو ادب میں لطافت و ظرافت کا عمدہ ذخیرہ خال خال ہے زیادہ تر ظرافت و مزاح میں کثافت کی آورد ثقالت و عریانیت نے ظرافت کے وہ عنصر جس سے قلب نظر آشفتہ پر بار گراں ہے۔ اردو کے چند مجموعے ظرافت کے مثلاً ’’ گلدستہ پنج فتنہ، خندہ گل، لاحول، شیطان، لطافت و ظرافت، غالبؔ کے لطیفے، اکبر کے لطیفے اور مجاز کے لطیفے اردو ادب کا ایک پیش بہا و انمول خزانہ ہے جس میں مشاہیر کے ظرافت قید ہیں۔

موجودہ دور میں ظریف شاعروں کی خاص اہمیت ہے اور کسی بھی مشاعرے کو سامعین کی دلچسپیں و رغبت کو برقرار رکھنے کے لئے ظریف شاعر کی موجودگی کامیابی کی ضامن ہے۔ اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اردو ادب میں ظریفانہ شاعری کی مانگ بڑھ گئی ہے اور اس کے اچھے ادبی انتخاب بھی شائع ہو رہے ہیں ادبی رسائل اور بچوں کے رسائل میں خاص طور پر اچھے اور معیاری ظرافت کو توجہ خاص دی جارہی ہے اکبرالہ آبادی نے ظرافت کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

سرد موسم تھا ہوائیں چل رہی تھی برف بار   شاہد معنی نے اوڑھائے ظرافت کا لحاف
ہم ایسی کل کتابیں قابل ضبطی سمجھتے ہیں   کہ جن کو پڑھ کے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

اکبر

اقبال جیسا مفکر شاعر بھی عوام کی دلچسپی سے متاثر تھے اور اکبرالہ آبادی کی شہرت اور ظرافت

کے چہرچوں نے ان کا بھی ذہن متوجہ ہوا تو فرمائے۔

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی ڈھونڈ لی قوم نے فلاح کی راہ

اقبال

شیخ صاحب بھی پردے کے کوئی حامی نہے مفت میں کالج کے لڑکے ان سے بدظن ہوگئے

وعظ میں فرمادیا کل آپ نے یہ صاف پردہ آخر کس سے ہو جب مرد ہی زن ہوگئے

اقبال

ذر کمانا ہو تو لکھ پڑھ کے پلیڈر بن جاو جب وکالت نہ چلے قوم کے لیڈر بن جاؤ

ظریف لکھنوی

اردو میں ظرافت کی تاریخ میں میرؔ، سوداؔ، انشاء، مصحفیؔ، آتشؔ، اکبرؔ، اقبالؔ، سرشارؔ، ظریف، شہباز اور شوقؔ وغیرہ شعراء نے ظرافت کو مقصدی بنا کر پیش کیا دوسرے دور کے شعرا نے ظرافت کو مکمل ایک فن کی حیثیت سے اختیار کر پوری شاعری میں ظرافت کو محور ومرکز بنا کر پیش کرنے والوں میں۔

چھوڑ کر ہم نے امیری فقیری کی اختیار بورے پر بیٹھے ہیں قالین کو ٹھوکر مار کے

عشمانیؔ

ریاضؔ، کلیم ارادت، صفدرؔ، وصلؔ، تسیم، فرقتؔ، جلالؔ، ماچسؔ عطاؔ، ناوکؔ، راکٹ، وغیرہ ظریف شاعر کہلائے۔

جھکادی تھی گردن یونہی میں نے رسما وہ سچ مچ اٹھالائے خنجر چنانچہ

تسیمؔ

ساغر لئے ہوئے کبھی مینا لئے ہوئے آتا ہے روز ایک تماشا لئے ہوئے

شرف لکھنویؔ

یہ دوستی کے نام سے گلے میں ہاتھ ڈال کے گلا نہ یوں دبایئے مری زبان نکل پڑے

جویا

اردو ادب میں ظرافت کی مقبولیت نے موجودہ صورت حال سے اس خیال کو تقویت ہوئی ہے کہ ظرافت نگاری سنجیدہ شاعری وادب کے مقابلے میں زیادہ واضح اور روشن ہیں اردو زبان وادب کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس کی ترقی بھی فطری طریقے سے ہو رہی ہے صرف ضرورت اس بات کی ہے کہ ظرافت کا معیار بلند ہو اور طریقہ اظہار میں متانت کے ساتھ حسب مراتب کا خیال رکھا جائے۔

☆☆☆

اردو صحافت

صحافت عربی زبان کے لفظ صحیفہ سے بنا ہے اس کے لغوی معنی اخبار نویسی کتاب، رسالہ یا صفحہ کے ہیں۔ اصطلاح میں صحافت کثیر المعنی لفظ ہے یہ اردو کے ابتدائی زمانہ میں اخبار و رسائل میں شائع ہونے والی خبروں کو صحیفہ یا رسائل میں مخصوص گوشے یا اضافی پرچی کو صحیفہ یا ضمیمہ کہتے تھے ان چیزوں کو صفحہ قرطاس پر لانے کے مراحل سے گذرنے والے اشباب کو صحافت کہا جاتا تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ جیسے جیسے طباعت نے ترقی کی اس کے معنی بھی بدلتے گئے بیسویں صدی میں یہ ایک فن کی حیثیت اختیار کر گئی۔ آج کے دور میں صحافت ذریعہ معاش اور ایک ذبردست طاقت بن کر ابھری ہے اسے سرکاری مراعات سے نواز گیا ہے الکٹرونیک میڈیا نے صحافت کی دنیا میں انقلاب پیدا کر دیا کیوں کہ ریڈیو، ٹی وی وغیرہ کے ذریعہ پل بھر میں دنیا جہان کی خبریں ایک جگہ سے دوسری جگہ آسانی سے پہنچائی جاتی ہے۔ سرکار نے اس کے لئے الگ سے شبعہ نشریات و اطلاعت کھول کر اس کے فوائد و اہمیت کا اظہار کیا ہے۔ اب توجدید ٹکنالوی میں Mass Comnication تعلیمی درس گاہوں میں دوسرے شبعہ کی طرح اس کی بھی پڑھائی ہونے لگی ہے۔

اردو میں صحافت نگاری کی ابتدا فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد نشر و اشاعت کی غرض سے شروع ہوئی 1810ء میں اردو کا پہلا اخبار مولوی اکرام علی نے کلکتہ سے نکالا، انہوں نے اردو رسم الخط کا پہلا مطبع ''ہندوستانی پریس'' کے نام سے کلکتہ میں قائم کیا اور اسی مطبع سے پہلی بار ''اردو اخبار'' کے نام سے نکالا تھا۔ اس اخبار میں مقامی خبروں کے علاوہ سرکاری پالیسی کی وضاحت اور ترقیاتی منصوبوں کا ذکر ہوا کرتا تھا۔ مولوی اکرام علی فورٹ ولیم کالج میں دارلترجمہ کے ملازم تھے جان کل کرائسٹ مطبع قائم کرنے اور اردو میں اخبار نکالنے کی ترغیب دی تھی۔ اردو کا دوسرا اخبار'' جام جہاں نما'' 27 مارچ 1822ء میں کلکتہ سے نکالا گیا۔ اس کے ایڈیٹر ہری ہردت اور منشی لالہ سدا سکھ تھے۔ اس اخبار کو بھی انگریزی کی ایک تاجر کمپنی ولیم ہاپکنس پرس اینڈ کمپنی نے مالی معاونت کی تھی اس اخبار میں ادبی سرگرمیوں اور سرکاری مراعات کے ساتھ کمپنی کے پروڈکٹ کی تفصیل ہوا کرتی تھی۔ شروع شروع میں تو یہ اخبار اردو زبان میں نکلتا تھا لیکن تقریباً ایک سال کے بعد یہ فارسی میں نکلنے لگا بعد میں فارسی اور اردو دونوں زبان میں شائع ہونے لگا۔

1823ء میں اردو کا پہلا ہفتہ وار اخبار ''شمش الخبار'' اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شائع ہوا۔ یہ پہلا ہفتہ وار تھا جس میں دیگر احول ضروری کے بعد ادبی سرگرمیوں اور تخلیق شامل ہونے لگا جب انگریزی حکومت نے 1835 میں فارسی کی جگہ اردو کو عدالتی زبان قرار دیا تو ہر چہار جانب سے اردو کی ترقی مقبولیت اور اشاعت کا کام شروع ہونے لگا۔ اردو صحافت عہد سنگ سے نکل کر لیتھوگرافی پرنٹنگ کا آغاز ہوا لیتھو کے بازار میں آتے ہی طباعت کا کام کچھ آسان ہوا تو لوگوں میں زبان اور خبروں کے تناسب سے بیداری پیدا ہوئی 1831ء میں دہلی اخبار اردو سے خالص اور اخبار نویسی کا دور شروع ہوتا ہے اور ملک کے نئے کونے سے باذوق حضرات اپنی تگ ودو کا مظاہرہ کرتے ہوئے اردو صحافت کے فروغ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے۔ 1837ء میں دہلی ہی سے ''سیدالخبار'' کی اشاعت شروع ہوئی جو تقریباً گیارہ سال تک مسلسل چھپتا رہا۔ 1840ء میں مدراس سے ایک اردو اخبار ''جامع الاخبار'' شائع ہوا اور 1844ء میں دہلی سے ''نور مشرق'' کی اشاعت شروع ہوئی 1846ء میں سینٹ اسٹیفی کالج کے ایک پروفیسر رام چندر نے ''فوائدلناظرین'' کے نام سے اخبار نکالنے لگے جس کی شہرت اہل دہلی والوں میں کافی تھی لوگ بہت ہی شوق سے اس اخبار کا مطالع کرتے تھے اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ اس اخبار میں مقامی خبروں۔ ادبی مضامین کے علاوہ تعلیم کے فوائد پر مسلسل کالم لکھے جانے لگے۔ اب تک جتنے بھی اخبار و رسائل نکلتے رہے تھے ان میں کسی طرح کی Artistic نمائش کا فقدان ہوا کرتا تھا لیکن اردو صحافت نگاری میں جدت لاتے ہوئے پنڈت دھرم نارائن نے پہلی بار تصویر ہفتہ وار اخبار 'قران السعدین' نکالنا شروع کیا۔ باتصویر ہونے کی وجہ کر یہ لوگوں میں کافی مقبول ہوا اور توجہ کا مرکز بنا پروفیسر رام چندر کے اخبار کی شہرت اور مقبولیت نے انہیں اور ہمت دلائی اور ایک ماہنامہ ''محب ہند'' کے نام سے نکالنے لگے۔ اس میں سیاسی، سماجی اور اخلاقی مسائل پر مبنی مقالے و مضامین اور اداریہ ہوا کرتا تھا 1857ء کی جنگ آزادی کی لڑائی تک آگرہ سے ہفتہ وار اسعد الاخبار مدراس سے ''عظیم الخبار'' مالوہ اخبار اور مرزاپور سے خیر خواہ ہند'' دہلی کا ''دارالاسلام'' گلزار ہمیشہ بہار وغیرہ اخبار نکلتے تھے صحافت نگاری کی تاریخ میں صوبہ بہار بھی پیچھے نہیں رہا جولائی 1853ء میں آرہ سے ''نورالانوار'' نکلا اس کے مالک سید محمد ہاشم بلگرامی اور مدیر سید خورشید احمد تھے۔ دس روزہ اخبار ''ہرکارہ'' پٹنہ سے 21 اپریل 1855ء سے شاہ ابوتراب نے نکالی یکم مئی 1856ء سے جے جے رام مختار کی ادارت میں گیا سے ''ویکلی رپوٹ'' جاری کیا۔ اور لالہ بندہ پرساد نے یکم ستمبر 1856ء پٹنہ سے دس روزہ اخبار ''اخبار بہار'' کا اجرء کیا۔

پہلی جنگ آزادی کے بعد اردو صحافت پر فرنگی دباؤ کی وجہ کر سیاسی مسائل پر نہایت احتیاط برتی

جانے لگی مغربی علوم فنون پر زیادہ توجہ مرکوز رہی، اب زبان و بیان پہلے سے کہیں زیادہ سلیث، سادہ اور عام فہم ہونے لگی، لکھنؤ سے اودھ اخبار کی شہرت ومقبولیت کو دیکھتے ہوئے 1877ء میں ''اودھ پنچ'' کی اشاعت شروع ہوئی۔ اس کے مدیر منشی سجاد حسین تھے۔ اردو صحافت کا ایک نیا دور مولانا ابوالکلام آزاد کے ''الہلال'' سے شرو ہوا۔ اس میں آزاد نے سیاست مذہب ار معاشرت پر بے باک اظہار خیال اور سیاست کے میدان میں انقلاب لانے کی غرض سے جو شیلے بھڑ کاؤ تیور سیاسی حلقوں کو خوب گرمایا۔ اس کے بعد بجنور سے ''مدینہ'' لکھنؤ سے ''ہمدم'' دہلی سے ''ہمدرد'' اور کانپور سے ''آزاد'' کی اشاعت نے اردو صحافت کو مزید تقویت عطا کی۔ اخباروں کی مقبولیت اور صحافیوں کی جرٔت کو دیکھتے ہوئے 1910ء میں پریس ایکٹ پاس کر کے صحافت نگاری پر پابندی عائد کر دی گئی۔ اس کے بہت سے اخبار شکار ہوئے ان میں بہار کے دو اخبار ''مشیر'' اور ''اتحاد'' بھی اتاب فرنگی کی زد میں آ گیا۔ 'اتحاد' اخبار شروع میں سہ روزہ بعد میں ہفتہ وار ہو گیا یہ 1913ء میں بہار شریف سے شیخ نور محمد کی ادارت میں نکلتا تھا۔ اس کے بارے میں داکٹر عبدالمغنی نے لکھا ہے۔ اتحاد پٹنہ کا واحد اخبار تھا۔ اس بات میں کوئی مبالغہ نہیں کہ اتحاد اپنے وقت کا ایک تاریخی ادارہ تھا اور اس اعتبار سے اسے بہار کی موجودہ اردو صحافت کی ماں کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا،'' اسی زمانہ میں مولانا ابوالکلام آزاد نے دوسرا اخبار ''البلاغ'' نکالا۔

1919ء میں لکھنؤ سے ''حقیقت'' اور لاہور سے ''پرتاپ'' کی اشاعت شروع ہوئی لالہ لاجپت رائے نے ''بندے ماترم'' کے نام سے اردو میں اخبار نکالا اور ''زمیندار'' ظفر علی خاں کی ادارت میں نکلنا شروع ہوا 1922ء میں خوش حال چند نے ملاپ اور سوامی سردھانند نے ''تیج'' نکالا 1926 میں سیاست اور انقلاب نکالا۔ ایک بار پھر مولانا آزاد نے کلکتہ سے 1936ء میں ''انجام'' نکالا اور خوشتر گرامی نے 1937ء میں ''بیسویں صدی'' پنڈت جواہر لال نہرو نے 1945ء میں قومی آواز'' نکالا۔ اس سے قبل 8 ستمبر 1942ء سے ''صدائے عام'' کا اجراء ہوا شروع میں تو یہ حکومت بہار کی جانب سے نکلتا تھا بعد میں اسے نظیر حیدر نے خرید لیا اور اس کے مالک واڈیٹر ہوئے یوں بہار میں اردو صحافت شائع ہونے والے اخباروں رسالوں کی تعداد بہت ہے لیکن جنہوں نے نمایاں کار کردگی کا مظاہرہ کیا ان میں ساتھی، سنگم، قومی آواز، قومی تنظیم، فاروقی تنظیم، پندار وغیرہ ایسے اور بے شمار اخبار ہیں جنہوں نے اردو صحافت کی تاریخ میں اپنا نام جوڑنے کا کام کیا ہے۔ آزادی کے بعد سے آج تک اردو صحافت کی ایک لمبی تاریخ ہے۔ اس میدان میں بہت سے ابھرتے ڈوبتے اخباروں نے اردو صحافت کو جلا بخشی اور اردو صحافت پتھر کے دور سے گذر کر آفسیٹ پرنٹنگ نے اردو صحافت کے سابقہ مشکلات کو دور کر دیا پھر بھی

طباعت کا مسئلہ دشوار کن بنا رہا کیونکہ اس میں ہاتھ کی لکھائی پر انحصار کرنا پڑتا تھا جس کی وجہ کر طباعت اور اشاعت میں تاخیر کا سبب بنتا تھا۔ بیسویں صدی کے آخری دہائی سے صحافت میں میکانکی طور پر ترقی ہوئی اور تمام مصائب کو کمپیوٹر کی کمپوزنگ نے آسان کر دکھایا رنگین اشاعت، تصاویر کی رنگا رنگی نے یوں کہیں کہ اردو صحافت اپنی تمام کامیابیوں اور کامرانیوں کے ساتھ جلوہ افروز ہے کمپیوٹر کمپوزنگ اور بڑی بڑی خودساختہ مشین کے ذریعہ برسوں و مہینوں میں پورا ہونے والا کام اب ایک دن میں پورا ہو جاتا ہے طباعت واشاعت کی اس تیز رفتاری کی وجہ کر ملک گیر پیمانے پر اردو روزناموں ہفتہ وار ماہواری اور سہ ماہی وشش ماہی اخبار ورسائل کی اشاعت میں صحافت کے میدان کو روزگار کا ایک آسان اور بروقت عمل میں آنے والا سکٹر بن گیا ہے روز کوئی نہ کوئی نئے اخبار ورسائل کا اجرا ہوتا ہے تو کوئی نہ کوئی اخبار ورسائل بند بھی ہو جاتے ہیں۔

اردو صحافت آج کے دور میں جدید تکنالوجی سے لیس ہونے کے باوجود ایک بہت بڑی کمی محسوس کی جاتی ہے اور وہ ہے نیوز ایجنسی کی جسطرح انگریزی میں UNI,PTI اور بھارتی نیوز ایجنسیاں کام کرتی ہیں اس طرح کا اردو صحافت کے میدان میں نیوز ایجنسی کا فقدان ہے۔ اردو تک وہی خبریں آتی ہیں جو ان زبانوں کے کام کا ہوتا ہے ان خبروں کا کیا ہوگا جو اردو والوں کے کام کا ہے۔ اردو کا صحافی اور خبررساں آج بھی کسم پرسی کے عالم میں ہے اس شعبے سے لگے لوگ مالی بدحالی کے شکار ہیں بہ حالت مجبوری اور صحافت میں لگے ہیں۔ اس کا ذمہ دار کان ہے؟ وجہ ہمیں خود تلاش کرنی ہوگی۔ غرض کہ اردو صحافت کا سفر تمام ترقیوں کے باوجود محتاج التفات نظر ہے۔

☆☆☆

اردو میں بچوں کا ادب

انگریزی کا ایک مقولا ہے Child is the father of Nation بچے ملک وقوم کی امانت ہیں اور مستقبل کا معمار۔ اس لئے ہمیں چاہئے کے بچوں کی تعلیم و تربیت کا پورا خیال رکھیں۔ ہمیں یہ بھی خیال رکھنا ہوگا کہ اسے کیسی تعلیم دیں کیسی تربیت دین تا کہ اس کا آنے والا کل روشن اور تابناک ہو اور ملک وقوم کے لئے فلاح کا کوئی ایسا کارنامہ انجام دے جس پر اس کا ملک وقوم فخر کرے ایسا اسُی وقت ممکن ہوسکتا ہے جب ہم بچوں کی خواہش اور اس کی فطرت کے مطابق اپنے مقاصد کے سانچے میں دھالنے کی کوشش کریں۔ اوّل تو اسے گھریلو ماحول ایسا ملے جہاں تعلیم کی اہمیت افادیت کے ساتھ ذہنی نشو ونما میں پیناپن ہو۔ ابتدائی تعلیم میں جدّت لائی جائے پھر ایسی کتابوں کا مطالعہ اس کے لئے مختص کیا جائے جس میں تعلیم کی سماجی اخلاقی اور سائنسی معلومات و جدید ٹکنالوجی سے واقفیت دلائی جائے۔ تعلیم کے میدان میں اردو سے رغبت اور اس کے لئے مفید اور مزاج کے حسب حال کتابیں ہوں۔

اردو میں بچوں کا ادب الغرض اردو ادب میں بچوں کے مفاد میں ادب کی اہمیت وافادیت مسلّم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو میں تمام بڑے شاعروں اور ادیبوں نے بچیوں کے مزاق سلیم کے موافقت کے مناسبت سے ادب تخلیق کیا ہے جس میں اخلاقیات کے ساتھ معلوماتی رویہ اخبار کیا گیا۔ جب ہم بچوں کے ادبی سفر کا مطالعہ کرتے ہیں تو پہلے پہل میری نظر محمد حسین آزاد کی کاوشوں پر پڑتی ہے جیسا کہ ہم سبھی جانتے ہیں کہ بچے کھلتی ہوئی کلیاں اور انمول رتن ہیں۔ جن کے رنگ و بو، چمک دمک اور نور سے زندگی میں رونق اور قوم و ملک کی تاریخ مرتب کرتا ہے جمہوری نظام میں ایک اچھے شہری باوقا سماج کی تشکیل کرتا ہے اور ان کے کردار وافکار سے قوم کی ترقی کا بنیادی عنصر ہے۔

ہندستان میں عہد قدیم سے بچوں کے تئیں محبت اور ہمدردی کے جذبات کے مظاہر جلوہ افروز رہے ہیں جدید دور میں نئی تعلیم نے بچوں کی روشن مستقبل کی افادیت کو تسلیم کرتے ہوئے اس کی ترقی کے نفسیاتی پہلو پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ بچوں کے ذوق کے مناسبت سے آسان اور جاذب طریقہ اختیار کر ادب کی تخلیق کی کوشش جاری ہیں بچوں کے ادب کی تخلیق بہت ہی نازک اور حساس فن ہے اس میں بچوں

کے ذہنی ارتقاء وترقی میں معاون و مددگار ثابت ہوں اور اس کے کلی و کاش کا مواقع فراہم ہوں ۔ بچوں میں ابتداء ہی سے بے خوفی تفریحات سے دلچسپی ، ایک دوسرے سے بے پناہ ہمدردی اور بلند حوصلہ پایا جاتا ہے مزید ادب کے ذریعہ بیدار بھی کیا جاسکتا ہے۔

اردو ادب میں بچوں کے لئے کلی ترقی کی روایت زمانہ قدیم سے دیکھنے کو ملتی ہیں ۔ قدما میں نظیر اکبرآبادی پہلے شاعر ہیں جنہوں نے بچوں کا ادب تخلیق کی طرف توجہ کیا اور چھ نظموں کا مجموعہ ''قل کے لڈو'' کے عنوان سے منظر عام پر آیا اس میں نظیر نے بچوں کے دلچسپی کے بہت سے پہلو کو اجاگر کیا ہے۔ محمد حسین آزاد اور حالی نے انجمن لاہور کے ذریعہ نظم نگاری کی طرف شاعروں کی توجہ مبذول کرائی اور انہوں نے خود دکئی نظم لکھ کر منصوبہ بند طریقے سے نظموں کا آغاز ہوا جس میں کئی شہرت یافتہ نظم خصوصاً بچوں کے لئے لکھا گیا محمد حسین آزاد نے ''شب قدر'' ، ''حب وطن'' ، ابر کرم اور ''صبح امید'' انجمن لاہور کے مشاعروں کے لئے لکھی گئی تھی الطاف حسین حالی نے ''برسات'' ، ''امید'' ، ''رحم'' ، ''انصاف'' اور ''حب وطن'' ، وغیرہ نظمیں انجمن کے مشاعروں میں پڑھی تھیں ۔ گویا ایہ نظمیں بچوں کے ادب کا آغاز تھا ۔ خصوصی طور پر بچوں کا ادب پر جس نے توجہ کی وہ تھے مولانا محمد اسمٰعیل میرٹھی ۔ انہوں نے اپنی شاعری کا زیادہ وقت بچوں کے ادب تخلیق کرنے میں گزار دی انہوں نے بچوں کے لئے درسی کتابیں لکھنے کی شروعات کی جو بہت ہی کارآمد ثابت ہوئیں ان کے شہ پاروں میں نظمیں ، کہانیاں اور اخلاق مضامین لکھ کر بچوں کے ذہنی ارتقاء میں معاون ثابت ہونے والی ادب تخلیق کیا مثلاً ان کی ایک نظم ہے ''تھوڑا تھوڑا بہت ہوتا ہے۔

بنا یا چڑیوں نے جو گھونسلا	سو ایک ایک تنکا اکٹھا کیا
درختوں کے جھنڈ اور جنگل لگے	یہی پتے پتے سے مل کر بنے
لگا دانے دانے سے غلّے کا ڈھیر	پڑا لمحے لمحے سے برسوں کا پھیر
اگر تھوڑا تھوڑا کریں صبح و شام	بڑے سے بڑا کام بھی ہو تمام

''ریل گاڑی نہر پر چل رہی ہے'' پن چکی اور گائے 'ان کی مشہور جاذب' دلکش پر تاثر سبق آموز اور مفید نظمیں ہیں گائے پر ان کی نظم بہت ہی مفید اور کارآمد ہے اس میں گائے کی خوبی اہمیت افادیت اور روز مرہ کی زندگی میں اس کی کارگذاریوں پر بہت ہی خوبصورت طریقے سے بیان کیا گیا ہے۔

رب کا شکر ادا کر بھائی	جس نے ہماری گائے بنائی
گائے کو دی کیا اچھی صورت	خوبی کی ہے گویا مورت

گائے ہمارے حق میں ہے نعمت　　　دودھ ہے دیتی کھا کے چارہ

''گائے'' نظم کے مطالعہ سے اس کی خوبیوں کی وضاحت ہوتی ہے یہ 18 بندوں پر مشتمل بہت ہی خوبصورت نظم ہے اور بچوں کی دلچسپی کے تمام مواقع فراہم کئے گئے ہیں۔ اسمٰعیل میرٹھی ے بچوں کے ادب کی تخلیق میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں اردو کے عظیم مفکر علامہ اقبالؔ نے بچوں کے ادب تخلیق کرنے میں اپنی دلچسپی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کئی نظم لکھی ہیں جس سے بچوں کا ادب ایک خاص توجہ کا مرکز بنا اور ایک اہم مقام حاصل کیا علامہ اقبال نے بچوں کے لئے کئی خوبصورت اور مشہور نظمیں لکھی ہیں مثلاً ہمالیہ، عہد طفلی، ابر کہسار، ایک مکڑا اور مکھی، ایک پہاڑ اور گلہری، ایک گائے اور بکری، بچے کی دعا، ہمدری، ماں کا خواب، پرندے کی فریاد، شمع و پروانہ، عقل و دل، شمع، ایک آرزو، طفل شیر خوار، چاند، ترانہ ہندی اور جگنو، نیا شوالہ، ابر، ایک پرندا اور جگنو وغیرہ میں علامہ اقبالؔ بچوں کے دل اور اس کے سوچ کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی نظم ''بچوں کی دعا'' میں اسی کی معصوم تمناؤں پر تاثر جاذب انداز میں بیان کیا ہے کہ دل اچھل کر ہاتھوں کو آجاتا ہے۔

لب پہ آتی ہے دعاء بن کے تمنا میری　　　زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری
دور دنیا کا مرے دم سے اندھیرا ہو جائے　　　ہر جگہ میرے چمکنے سے اجالا ہو جائے
ہو میرے دم سے یوں ہی میرے وطن کی زینت
جس طرح سے پھولوں سے ہوئی ہے چمن کی زینت

ہندستانی بچوں کا قومی گیت میں لکھتے ہیں۔

چستی نے جس زمیں میں پیغام حق سنایا　　　نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا　　　جس نے حجازیوں سے دشت عرب چھڑایا
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

اور پھر ترانہ ہند میں جب انہوں نے فرمایا کہ ؎

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا　　　ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
غربت ہون اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں　　　سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا
پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا　　　وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا　　　ہندی ہیں ہم وطن ہیں ہندستاں ہمارا

ترانہ ہندی لکھ کر جذبہ حب الوطنی کے احساس کی کلیاں صرف بچوں ہی نہیں بلکہ بڑوں کے

دل میں کھلا دی اور ہندوستان کا ہر فرد بلا امتیاز مذہب وملت گنگنا اٹھا'' سارے جہاں سے اچھا ہندستاں ہمارا''۔ بچوں کے ادب کی تخلیق میں حفیظ جالندھری نے کئی گیت، نظمیں اور کہانی لکھی ان میں ''بہار پھول'' اور ''پھول مالا'' بہت مشہور ہیں اور منظوم تاریخی کہانیوں کا مجموعہ ''ہندوستاں ہمارا'' سے ایک نظم ''کبڈی' میں لکھتے ہیں۔

اگر کھیل میں سانس ٹوٹا کسی کا	پھر اس پر ہاتھ چھوتا کسی کا
تو سمجھو کہ اب کھیل سے کٹ گیا وہ	الگ جا کے بیٹھا پرے ہٹ گیا وہ
اٹھا کہہ کے پھر دوسرا چل کبڈی	چلا چل کبڈی ، چلا چل کبڈی

تلوک چند محروم نے بھی بچوں کے ادب تخلیق کرنے میں گہری دلچسپی دکھائی اور کئی انگریزی نظموں کا ترجمہ اردو میں کیا ہے جو'' گنج معانی'' نام سے منظر عام پر آئی ہے محروم کو بچوں کی فطرت، عقل وفہم سے اپنی واقفیت کا مظاہرہ کیا ہے۔ انکا مجموعہ ''بہار طفلی'' کی کئی نظمیں بچوں کے درسی کتابوں میں شامل ہوتی رہی ہیں۔ محمد شفیع الدین نیر اپنی پوری زندگی بچوں کا ادب تخلیق کرنے میں لگا دی۔ انہوں نے بچوں کے لئے کتابوں کا چار سیٹ تیار کیا جس میں تقریباً تیس کتابیں ہیں ان کی ایک بہت ہی مشہور نظم ''بندر والا'' بڑا دلچسپ ہے۔

ڈگ ڈگ ڈگ کرتا آیا	بندر والا بندر لایا
بندر کے ساتھ ایک بندریا	پہنے ہوئے لال گھنگھریا
ہاتھوں میں ایک موٹا سا ڈنڈا	ڈنڈے میں اک لال سا جھنڈا
دیکھ کر کچھ لوگوں کا جمگھٹ	اس نے کھیل جمایا جھٹ پٹ

بچوں کا ادب تخلیق کرنے اور ان کے درمیان پسند کئے جانے والا شاعر حامد اللہ افسر کی نظم نیند کی پریاں' لالہ جی کی ٹوپی' ندیا پور اور سائنس کی' دعا' بچوں کے ادب کی تعمیر میں محوی صدیقی، امتیاز علی تاج نے ''چچا چھکن'' سے بے حد شہرت حاصل کی مخدوم عالم مارہروی کی لوری'' آغوش مادر'' کے نام سے کتاب آئی ہے۔ مس سیس بروک میں بہت خوبصورت لوریاں ہیں۔ انڈین پریس الہ آباد سے شائع ہونے والی کتاب میں تعلیم وتفریح کا خیال رکھتے ہوئے باتصویر چھوٹی چھوٹی کہانیوں کے ساتھ منظوم چٹکلے بھی ہیں۔ ''روٹھا شہزادہ'' اور ''منچلی'' اچھی نظمیں ہیں ایک چٹکلا بے وقوف لڑکا بہت دلچسپ ہے۔ ''بیاض گل'' میں چھوٹے بچوں کے لئے انگریزی نظموں کے ترجمے ہیں۔ ''جیبی گھڑی'' بچہ اور چراغ' ماں کی ممتا' دم کٹی لومڑی' وغیرہ ہیں ڈاکٹر ذاکر حسین نے بھی بچوں کے لئے ڈرامے، کہانیاں اور کئی مضامین لکھے

ان میں ''مرغی اجمیر چلی' عقاب' دیانت' ابو خان کی بکری' بہت ہی دلچسپ اور سبق آموز کتابیں ہیں۔

پروفیسر محمد مجیب کی کہانیاں اور ڈراما'' آؤ ڈرامہ کریں'' اردو میں بچوں کے لئے اپنی قسم کی پہلی کتاب ہے'' شیدلا'' ایک نٹ کھٹ اور بے وقوف کی دلچسپ کہانی ہے۔ڈاکٹر عابد حسین نے بچوں کی تعلیم وتربیت میں بڑی دلچسپی دکھائی ہے انہوں نے بچوں کے عادات واطوار اور کردار کو سدھارنے کے لئے بہت ہی پر مغض باتیں کہی ہیں۔کرشن چندر کا'' ستاروں کی سیر'' اور'' چڑیوں کی الف لیلیٰ'' میں دلچسپ کہانیاں لکھی جگن ناتھ آزاد نے ریڈیو فیچر ڈرامے اور نظمیں لکھی ان میں'' ہندوستان ہمارا'' اور'' بنگال کا جادو'' قابل ذکر ہے۔کیشو کمار نے پنچ تنتر کی کہانیوں کو چار جلدوں میں اور الیاس احمد مجیبی اور عبدالواحد سندھی کی تخلیق بچوں کے ادب میں اضافہ ہے مجیبی کی'' پھول کھلے'' گلنار بیگم اور سندھی کی''،'' روٹی کس نے پکائی'' باغ بولتے، چیونٹی کی رانی' پکڑ دم کٹے' تاک دھنا دھن تاک' وغیرہ قابل تعریف کتابیں ہیں۔نورالحسن نقوی کی'' حاتم کا قصہ'' محمد ندیم کی'' تیس مار خاں کے کارنامے'' عقل مند مچھر اور رابن سن کروسو'' غلام حیدر کی'' پیسے کی کہانی' کتھ کی کہانی' دلچسپ اور معلوماتی ہیں راج نارائن راج'' فٹ پاتھ' عمدہ کہانی ہے نیشنل بک ٹرسٹ نے بچوں کا ادب کے سایہ کو وسیع کرنے دلچسپ اور معلوماتی اور اخلاقی کتابیں شائع کر کے بہت بڑا کام انجام دیا ہے قابل قدر کتابوں میں کمال حسن کی آزادی کی کہانی پھول اور شہد کی مکھی، سب کا ساتھی سب کا دوست، ہندوستان نے آزادی کیسے حاصل کی وغیرہ ڈاکٹر شفی پریمی نے محاورے، کہاوت اور کہانی لکھی اردو میں اپنی نوعیت کی یکتا کتاب ہے۔صالحہ عبد حسین کی'' ایک دیش ایک خون' سندر چنار' جادو کا ہرن' سنہرے بالوں کے بچوں کا دیش' بیگم قدسیہ زیدی کی تصویر'' انتگ جان' بھن بھن بانوں (شہد کی مکھی) جاں باز سپاہی (دیمک) قراۃ العین حیدر کی'' شیر خاں''،'' بھیڑیے کے بچے'' میاں ڈھیچوں کے بچے، لومڑی کے بچے' پہاڑ جنگل کا راجہ یہ بھی ترجمہ ہے۔رضیہ سجاد ظہیر کی'' ہماری ندیوں کی کہانی' جنت کی سیر' بہت دن ہوئے۔بچوں کے ادب میں ایک موڑ لاتے ہوئے جامعی نے تعلیمی تاش کا آغاز کیا۔

اکیسویں صدی کے ابتداء تک اردو میں بچوں کا ادب ترقی کرتا ہوا دوسرے ترقی یافتہ زبانوں کے ادب کے قریب پہنچ گیا ہے اس میں ڈرامے کہانیاں' درسی مضامین' حروف شناشی' لوریاں' پہیلیاں' چٹکلے وغیرہ ہیں اردو میں بچوں کے ادب کی تخلیق ہر دور میں ہوئی ہے اچھی زبان سکھانا مہذب سماج کی تسکیل میں بچوں کا ادب نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کرتا ہے۔فن کی حیثیت سے بچوں کے ادیب کو بچوں کا راز داں بننا ہوتا ہے فن پارے کی موضوع اور اسلوب کے لحاظ سے بچوں کی فطرت سے ہم آہنگ ہونا ہوتا ہے تا کہ بچے مطالعہ کر کے مسرت حاصل کر سکیں۔

☆☆☆
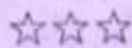
تحریک آزادی میں اردو کا حصّہ

اردو ہندوستان کی واحد مشترکہ زبان ہے جسکا کوئی مخصوص علاقہ نہیں بلکہ پورے ہندوستان میں بلاتفریق مذہب وملت یکساں طور پر بولی اور سمجھی جاتی تھی اور یہی وجہ ہے کہ دوسری علاقائی زبانوں کے مقابلے میں اردو ہندواسیوں کے لئے آسان ترسیل وابلاغ کا ذریعہ بنی۔ پہلی جنگ آزادی 1857ء میں ہندوستان کے مختلف صوبوں کے زمینداروں نوابوں اور راجاؤں نے متفق ہو کر انگریزی حکومت سے نجات حاصل کرنے کا نعرہ بلند کیا سبھو نے مل کر پھر سے مرکزیت کو قائم کیا اور بہادر شاہ ظفر کو متحدہ ہندستان کی آزادی کا کمان سونپ کر ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب اور یک جہتی کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتے ہوئے اردو کو متحد زبان تسلیم کیا اس کی وجہ یہ تھی کہ اردو ایک ایسی زبان تھی جس کو پورے ہندستان میں کم و بیش ہر جگہ بولی جاتی ہے۔ اسی کے ذریعہ اپنے خیالات کا اظہار خفیہ طریقے سے ایک جگہ سے دوسری جگہ تک بہ آسانی پہنچائی جاتی تھی۔ اب تک جو بھی مجاہد آزادی کے خفیہ خطوط دستیاب ہوئے ہیں ان میں اکثریت اردو کی ہے۔

1857ء کی ناکام کوشش کے بعد سب سے زیادہ قہر انگریزوں نے مسلمان اور اردو پر ڈھائی پھر بھی اردو کی شہرت ومقبولیت دنوں دن بڑھتی ہی گئی کیونکہ یہ عام عوام کی زبان تھی اور لوگوں کی جاذبیت و رغبت نے اردو کی گوناں گوں ترقی ہوتی گئی۔ 1857ء کے بعد شاعروں اور ادیبوں کی کوشش جس میں صبر وتحمل کے ساتھ تحریک آزادی کی بیج کو متحرک رکھنے کی ترغیب کے شبہ پارے آج بھی محکمۂ آثار قدیمہ میں محفوظ ہیں۔

ان سب شواہد سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ سرکار اور عوام دونوں کے درمیان ربط ونظم کا کام اردو انجام دے رہی تھی سرسید کی اصلاحی کوششوں اور علی گڑھ تحریک نے حکومت اور ہندوستانیوں کے درمیان نفرت اور تلخیوں کو دور کرنے کے لئے اردو زبان کا ہی سہارا لیا۔ آل انڈیا کانگرس کے قیام کا مسودہ اردو میں تحریر کیا گیا۔

محمد حسین آزاد اور الطاف حسین حالی نے پنجاب میں ایک سوسائٹی کا قائم کیا جہاں سے اردو نظم کو ترقی دی گئی اس میں شامل کئے گئے نظموں میں اکثریت وطن پرستی پر ہیں وطن دوستی کا جذبہ ملک عزیز

سے بے پناہ محبت کا اغاز ہوا یہی چنگاری آگے چل کر شعلہ بنا اور ہندوستانیوں کو پھر سے متحد ہو کر اپنے ملک عزیز کے بارے میں سوچنے پر مجبور کیا آہستہ آہستہ لوگوں کے دلوں میں انگریزی حکومت کے خلاف دبی ہوئی چنگاری شعلہ بننے لگا اور شاعروں ادیبوں نے اپنے کلام و نگارشات میں آزادی کہ لہو جذب کرنے لگے ایسے ایسے جو شیلے اشعار تخلیق کیئے گئے کہ ہر ہندوستانی کا دل دھڑک کر اچھل پڑے، مولوی ذکا اللہ چراغ دہلوی وغیرہ کے مضامین شعلے اگلنے لگے تھے اردو کا ایک طبقہ ایسا کھڑا ہو گیا تھا جو سینہ ٹھوک کر انگریزی حکومت کو بھگانے میں جٹ گئے اور عوام کو بیدار کرنے کے لئے طرح طرح کے دیش بھگتی گیت ۔غزل اور نظم کے علاوہ ہندستانیوں کے ماضی کے قصے کہانیاں اور پریم چند نے افسانے و ناولوں کے ذریعہ عوام کو بیدار اور جھنجوڑ کر اٹھانے میں لگ گئے تھے یہی وجہ ہے کہ پریم چند کے افسانوی مجموعہ کو انگریزی حکومت نے ضبط کر لیا تھا۔

اردو شاعری کی اصلاحی کوششوں اور انجمن پنجاب کے مشاعروں نے جدید شاعری کو خاص فروغ دیا اس طرح اردو شاعری حیات و کائنات کے مسائل کی بھرپور ترجمانی کے قابل ہو سکی اور جذبہ حب الوطنی، محبت و کاوش، امن و انصاف اور اخلاق و معاشرت شامل ہونے لگے۔ ان میں سب سے اہم حب الوطنی کا تصور تھا جو سیاسی اور قومی پس منظر کا حامل تھا۔ قومیت اور وطنیت کا احساس اور آزادی کی روح جدید شاعری کا بڑا وصف ہے اس دور کے تقاضوں کو نظم کی جدید تحریک نے حالات و جزبات کی ترجمانی کی اردو شاعری پہلی مرتبہ اجتماعی تحریکات کی باقائدہ ترجمان بنی ان سب میں حالؔی پیش پیش تھے اور شعوری طور پر ادب کا رشتہ اپنے زمانے کی سیاست اور معاشرت سے مربوط کر کے اجتماعی زندگی کے مسائل کا حل تجویز کرنا شروع کیا الطاف حسین حالی کی شاعری میں حب الوطنی کا تصور انجمن پنجاب کے تحت شاعروں میں شامل نظموں میں پیدا ہو چکا تھا۔ مسلمانوں کو وطن اور اہل وطن کی محبت اور دوستی ہمدردی خیر خواہی اور قومی و سیاسی رنگ جھلکتا ہے۔؎

اے وطن اے میرے بہشت بریں	کیا ہوئے تیرے آسماں و زمیں
رات و دن کا وہ سماں نہ رہا	وہ زمین اور وہ آسماں نہ رہا
ہے کوئی اپنی قوم کا ہمدرد	نوع انسان کا جس کو سمجھیں فرد
قوم پر کوئی زد نہ دیکھ سکے	قوم کا حال بد نہ دیکھ سکے
قوم سے جان تک عزیز نہ ہو	قوم سے بڑھ کے کوئی چیز نہ ہو

....

بیٹھے بے فکر کیا ہو ہم وطنوں　　اٹھو اہل وطن کے دوست بنو
تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر　　نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر

شبلی نعمانی ملک عزیز سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ فرنگی عامریت سے نالاں تھے جذبۂ حب الوطنی سے سرشار شبلی نعمانی کے نظم کے چند اشعار۔

ہاں کمر بستہ ہوائے قوم ترقی کے لئے　　آج کے کام میں اندیشہ فردا کیسا
نوجوانوں یہ زمانے کو دکھا دینا ہے　　اپنی قوت کو کیا قوم نے یکجا کیسا
قوم کے تازہ نہالان چمن ہو تم　　دیکھیں پھل لاتا ہے یہ نخل تمنا کیسا

مولوی نذیر احمد کی نظم کا یہ شعر۔

کچھ نہ پوچھو آج ہم لکچر میں کیا کہنے کو ہیں　　قوم خود قوم کے منہ پر بُرا کہنے کو ہیں

محمد حسین آزاد کی شاعری کا اہم موضوع حب وطن ہے اپنی مثنوی ''حب وطن'' میں وطن سے دریغ نہیں کرتے اور ذاتی فائدے پر قوم کے اجتماعی مفاد کو ترجیح دیتے ہیں۔

آج اس کا آفتاب ہے اوج فرنگ پر　　اور رات ہند کی ہے رخ تیرہ رنگ پر
حب وطن کی جنس کا ہے قحط سال کیوں　　حیراں ہوں آج کل ہے پڑا اسی کا کال کیوں

اسی مثنوی میں آزاد نے ہندستانیوں کو اپنے ہم وطنوں سے محبت والفت کا درس دیتے ہیں تا کہ ان میں آپسی محبت کا جذبہ پیدا ہو

اسمٰعیل میرٹھی اپنے عہد کے معاشرتی حالات سے پوری طرح واقف تھے جدید شاعری کی تحریک سے بھی وہ متاثر تھے اور نئے علمی وادبی رجحانات سے بھی باخبر ان کی نظم جدیدہ عبرت اور آشار سلف گہرے قومی درد کی آئینہ دار ہیں۔

ہاں قوم کے نو عمر نوجوانوں ادھر آؤ　　ہے دیدۂ بینا تو اسے کام میں لاؤ
موسیٰ بنو اور قوم کو ذلت سے بچاؤ　　گوسالہ غفلت کی پرستش کو چھڑاؤ
اٹھو قوم کی آبرو کو بچاؤ　　نہ بننے دو ہرگز غلام غلا مان

فرنگی ظلم اور حاکمیت سے بیزار ہندوستانیوں کا سیاسی شعور بیدار ہو چکا تھا محکومی کا احساس بھی انہیں مضطرب کرنے لگا تھا۔ اب ہر ہندوستانی کا ذہن غلامی کی زنجیر توڑ کر پھینکنے کو بے چین ہونے لگا تھا۔ ان کے ذہنوں میں وطن کی محبت نے سیاسی بسیرت اور فکر انگڑائی لینے لگی تھی۔ ان حالات نے حساس دلوں کو مضطرب کیا خصوصاً شاعر تو سب سے پہلے متاثر ہوتا ہے ایسے ہی حالات میں سرور جہاں آبادی کی

شاعری میں حب الوطن کا جزبہ شدّت سے محسوس ہوتا ہے وہ ہندو اور مسلمان دونوں کو وطن سے بے پناہ محبت کی پرخلوص ترغیب دیتے ہیں۔

دل سرد ہیں رگوں میں گویا لہو نہیں ہے　　حب وطن کی ہم میں وہ آہ بو نہیں ہے

ہم ستائے ہوئے ہیں گردش ایام کے آہ　　ہم کو یاروں سے نہیں شکوہ بیدار وطن

خواب گراں ہے چونکو ہندوستان والو　　پستی میں کیوں پڑے ہو اونچے نشان والو

چکبست کی شاعری اپنے زمانے کے اہم سیاسی اور سماجی حالات و واقعات کی آئینہ دار ہے سرور کی طرح ان کو بھی حب الوطنی کا شدید احساس تھا۔

گُل شمع انجمن ہے گو انجمن رہی ہے　　جب وطن نہیں ہے خاک وطن وہی ہے

علامہ اقبالؔ کی حب الوطن جگ ظاہر ہے ملک عزیز جن سیاسی اور سماجی بحران سے نبرد آزماہ تھا۔ علامہ اقبالؔ اس محبت کا موازنہ یورپ والوں سے کی اور افراد وطن یا اہل وطن کی بھلائی کی خاطر کسی بھی ایثار سے بڑی طرح متاثر تھے ان کو وطن سے بے انتہا پیار تھا۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا آپس بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہندوستاں ہمارا

....

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تیری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

علامہ اقبالؔ

حسرتؔ موہانی کی شاعری سیاسی رجحانات کے اعتبار سے نمایاں اہمیت رکھتی ہیں ان کے کلام میں سیاسی چیز، محکومی اور غلامی کا شدید احساس موجزن ہے ۔انہوں نے اپنے جذبوں کو تحریک آزادی میں ادبی اور عملی دونوں اعتبار سے شریک ہو کر ''اردوئے معلیٰ'' کے ذریعہ لوگوں کو جوش دلانے کا کام بھی کیا۔

اچھا ہے اہل جو رکئے جائیں سختیاں　　پھیلے گی یوں ہی شورش حب وطن تمام

وہ جرم آرزو پر جس قدر چاہیں سزا دے لیں   مجھے خود خواہش تعزیر ہے ملزم ہوں اقراری
خوشی سے ختم کر لے سختیاں قید افرنگ کی   کہ ہم آزاد ہیں بیگانہ رنج دل آزاری

یوں تو اکبرالہ آبادی ظریفانہ شاعری کرتے تھے اور سرکاری ملازم بھی تھے لیکن تحریک آزادی کی چنگاری ان کے دلوں کو شعلہ بنانے کو مضطرب تھی ان کے کلام میں وطن کی محبت کا اظہار عیاں ہے۔

مٹاتے ہیں جو وہ ہم کو تو اپنا کام کرتے ہیں   مجھے حیرت تو ان پر ہے جو اس مٹنے پر مرتے ہیں
دھن دیں کی تھی جس میں گاتا تھا اک دیہاتی   بسکٹ سے ہے ملایم پوری ہویا چپاتی

ظفر علی خاں بڑے تمتراک سے کہتے ہیں ۔

جتنی بوندیں تھیں شہیداں وطن کی   قصر آزادی کی آرائش کا ساماں ہوگئی
گاندھی نے آج جنگ کا اعلان کر دیا   باطل سے حق کو دست و گریباں کر دیا

شاعر انقلاب حضرت جوش تحریک آزادی کے ان پروانوں میں ہیں جو بے خطر آتش نمرود میں کود جاتے تھے۔

کہ آزادی کا ایک لمحہ ہے بہتر   غلامی کی حیات جاوداں سے
نوجواں کرتے ہیں جب سرگوشیاں پیار کی   صاف آتی ہے صدا چلتی ہوئی تلوار کی

جگر مرادآبادی تحریک آزادی کے ایک سپاہی کی حیثیت سے پیش پیش رہے اور اپنے کلام کے ذریعہ اپنے ہم وطنوں میں یکجہتی قائم کرتے ہوئے فرنگی کو ملک چھوڑنے کے لئے مجبور کیا۔

ان کا جو فرض ہے وہ اہل سیاست جانیں   میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے
پرائے ہاتھ جینے کی ہوس کیا   نشیمن ہی نہیں تو پھر قفس کیا

اختر شیرانی

عشق و آزادی بہار زیست کا سامان ہے   عشق میری جان آزادی میرا ایمان ہے
عشق پر کردوں فدا میں اپنی ساری زندگی   لیکن آزادی پہ میرا عشق بھی قربان ہے

تحریک آزادی کے سرگرم رکن سیماب اکبرآبادی، حشمت کلکتوی، حفیظ جالندھری، سردار جعفری، مخدوم، فیض وغیرہ شاعروں کی شاعری کا موضوع آزادی اور غلامی سے نجات ہے۔

زنجیر چھنکتی ہے پس پردہ ساز   مطلق الحکم ہے شیرازہ اسباب ابھی
ساغر ناب میں آنسو بھی ڈھلک جاتے ہیں   لغزش پا میں ہے پابندی آداب ابھی

کیفی اعظمی، ساحر لدھیانوی، شکیل بدایونی، سکندر علی وجد، جان نثار اختر اور مجاز نے تحریک آزادی میں بڑھ

چڑھ کر حصہ لیا۔

توڑ کر بیڑی نکل آئیں گے زنداں ۔ بھول جائیں گے عبادت خانقاہوں میں فقیر ۔ مجازؔ احمد ندیم قاسمی، غلام ربانی تاباںؔ، ظہیر کاشمیری اور جمیلؔ مظہری، احسان دانش ساغر نظامی، تصدق حسین خالد ،فراق گورکھپوری ابوالکلام آزاد، پریم چند نیاز فتح پوری، وغیرہ شاعروں اور ادیبوں نے تحریک آزادی میں خود بھی شریک ہوئے اور اپنے کلام سے ہندوستانیوں کے دلوں کو خوب خوب للکارا اور فرنگی حکومت کو سرنگوں کرنے کی جدو جہد میں شریک رہے اردو زبان وادب ہندوستان کی دیگر زبانوں کے مقابلے کہیں زیادہ فعال اور متحرک تھی ۔ ان کے دلوں میں جوش وولولہ پیدا کرنے کی صلاحیت بہت زیادہ تھی بسملؔ عظیم آبادی کا یہ شعر ہر ہندوستانی بڑے فخر سے گاتے ہوئے تختہ دار پر چڑھ جایا کرتے تھے ۔

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

بسملؔ عظیم آبادی

پابند ہمیں کرنے کے لئے سو راہیں نکالی جاتی ہیں
قانون بنائے جاتے ہیں زنجیریں ڈھالی جاتی ہیں

جمیلؔ

☆☆☆

قومی یک جہتی اور اردو

ہندوستان ایک گل بداماں ملک ہے یہاں کے باغوں میں مختلف قسم کے گل و بوٹے کھلے ہوئے ہیں۔ دنیا کا یہ واحد ملک ہے جہاں مختلف مذاہب تہذیب وتمدن، زبان و بیان رہن سہن، طور طریقہ رسم ورواج اور عقیدہ وحقانیت کے چشمے الگ الگ ہوتے ہوئے بھی ایک جگہ پھوٹے ہیں ایسی مثالیں دنیا کے کسی بھی ملک کو نصیب نہیں ہر طبقہ فکر کے لوگ اپنے عقیدے کی مطابقت سے بڑی سختی کے ساتھ عمل پیرا ہیں یہ تمام لوگ اپنے عقائد اور مذاہب کی پیروی میں شدت سے پیار کرتے ہیں اور اپنے تئیں حساس بھی ہیں۔ ایسے ماحول میں متفرق ذہن، سوچ، فرقہ کے لوگوں کو متحد رکھنا بہت ہی دور اندیشی عقل مندی فہم وفراست دور بینی کے ساتھ مماثلت کو قائم رکھنا ایک کارگراں ہے اس پہ طرہ یہ کہ فرنگی دور حکومت میں پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو، کی سیاست نے ہندستانیوں کے اندر نفرت کا کوہ ہمالہ کھڑا کر رکھا تھا جس کے سبب روز مرہ کی زندگی میں دو قوموں کے درمیان کشیدگی اور نفرت اپنے انتہا کو پہنچی ہوئی تھی اور یہ آگ اب تک متواتر لگی ہوئی ہے کوئی ایسا طریقہ نہیں ملتا کس سے ان کی خلش کو دور کیا جائے جس سے دہکتی آگ کو بجھا سکے اس بات کا احساس آج ہم نہیں محسوس کرتے ہیں بلکہ آزادی سے قبل کے سیاست دان سماجی مبلغ شاعر وادیب شدت کے ساتھ محسوس کیا اور ان کھائیوں کو پاٹنے کی حت المقدور کوشش بھی کی ہے۔

جیسا کہ ہم بھی جانتے ہیں کہ زبان اردو دو قوموں کے امتزاج سے پیدا ہونے والی زبان ہے اس میں بہ یک وقت گنگا اور جمنا کی دھارائیں ایک ہو کر بہتی ہے یہی وجہ ہے کہ اردو کو لوگوں نے گنگا جمنی تہذیب کی پیداوار تسلیم کیا ہے اردو کے طور طریقے سے بھی یہ پتا چلتا ہے کہ جسم ہندی میں روح فارسی داخل کر دی گئی ہے۔ اور ادب کے ابتدائی نمونے کے مطالعہ سے اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ دو حصوں کے درمیان دوری کو کم کرنے کے لئے جن لوگوں نے پہل کی ان میں سب سے پہلے صوفیائے کرام کا اہم رول رہا ہے بلا امتیاز مذہب وملت کے صوفی بزرگوں کے آستانوں پر حاضری اور عقیدت کے پھول چڑھانے کا رواج آج بھی دیکھنے کو ملتا ہے قومی یک جہتی کی اولین منزل ہے دوسری طرف ادیبوں اور شاعروں نے اسے شدت کے ساتھ محسوس کیا اور اپنے ادبی سرمایہ کے ذریعہ لوگوں کو آپسی رقابت اور دوری کو بھلا کر ایک متحد قوم کی صورت میں جلوہ افروز ہوں اس اختلاف کی مہک امیر خسرو نے بھی محسوس کی تھی لیکن آج اس کے جلنے اور سڑنے کی سڑاندھ سدت سے دیکھی جارہی ہے آزادی سے قبل ہندستان میں ایک ماحول اتحاد کا بنا تھا جس میں دونوں

بڑی قومیں متحد ہو کر فرنگی سامراجیت سے نجات حاصل کرنے کے لئے لوہا لیا۔ اس دوران یک جہتی کی ضرورت زیادہ ہوئی اور سیاست سے ادب تک لوگوں نے دونوں کو ایک پلیٹ فارم پر لانے کی کوشش کرنے لگے۔ انگریز بھی اپنی حکومت کو بچانے کے لئے ان کے درمیان نفرت کی ہوا کو مزید تیز کر دیا یعنی ذلزلہ سانس لیتی رہی زیرز میں جیسے تیسے آزادی تو ملی لیکن اس کی قیمت نفرتوں کی قربان گاہ پر بھنٹ چڑھ گئی۔ دوقوموں کے درمیان کی دوری کو پاٹنے کا کام اردو نے کیا ہے۔

دینا کی دو بڑی قومیں ہندو اور مسلمان کے پاس اپنا مخصوص روادوری، تمدن، تہذیب، فنون لطیفہ تھا دونوں کے پاس قومی سرمایہ اور امتیازی شان اور خصوصیت تھی جب مسلمان فاتح کی حیثیت سے صوفی و حاکم کی صورت میں داخل ہوئے تو دونوں آریائی تہذیب کے سبب کچھ قدریں مشترک تھیں۔ اتنی اجنبیت نہ تھی کہ مغائرت حد فاصل بن کر دونوں کو زیادہ عرصہ تک رکھتی جو مسلمان ہندوستان کے معاشرہ میں اسطرح مل گئے کہ امتیاز باقی نہ رہا۔ امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ یہاں کے رسوم، اطوار طرز معاشرت دونوں میں حلول کر گئی اسکا اثر فن تعمیر موسیقی، مصوری اور کلچر کی آویزش نے ایک نیا مذاق پیدا کر دیا جو دونوں تمدن و تخیل سے مل ملا کر ترمیم شدہ صورت میں وجود میں آیا یہ ہندستانی کلچر اکبر اور جہانگیر کے عہد حکومت میں خوب پروان چڑھی اسکی نمایاں مثال اردو زبان کی پیدائش ہے۔

الفاظ خیالات کے ردو بدل نے ہندو اور مسلمان دونوں کو اس اختراع کے لئے مجبور کیا۔ دونوں کے اظہار خیال کے لئے ایک نیا اور مشترکہ آلہ کار اردو کے روپ میں وجود پزیز ہوا۔ مخلوط تمدن و مذاق نشو نما پا سکیں اس کے احساس کی ترجمانی کے لئے جس زبان کو جنم دیا وہ اردو تھی مختلف اوقات میں یہ نوزائدہ زبان کو ہندو مسلمان اس کو اپنی زبان سمجھنے لگے اس نئی زبان نے دونوں قوموں کو قریب سے قریب تر لانے میں بڑی سہولتیں پہنچائیں۔ چونکہ اس کا وجود ہندو مسلمان کے میل جول سے ہوا تھا اس لئے اس کی رفتار و گفتار میں بڑی رواداری پیدا ہوگئی گویا ابتدا ہی سے دوقوموں کو متحد مستحکم بنانے میں اردو نے اہم فریضہ نبھایا ہے بقول شاعر۔

ہاتھ چومیں گے مرے گبر و مسلمان دونوں
ایک میں دست صنم ایک میں قرآن ہوگا

اردو نے قومی یک جہتی کی شان یوں دی کہ صوفی شعراء نثر نگار نے ادبی موشگافیوں کا بیڑا اٹھایا اور مذہبی روح و رواداری کو اپنے تخیل سے انسان کو انسان بنانے کی تگ و دو میں لگ گئے یہ لوگ سوم کی پابندی اور ظاہر داری کا خیال کئے بغیر ہندو مسلم دونوں کو بحیثیت آدمی یکساں سمجھتے تھے۔ تصوف اس وقت

ترقی پسند لوگوں کا شوق تھا جس کی وجہ سے زبان وخیال میں بڑی رواداری کر دیا اور اردو زبان روایت بن کر کام کرنے لگی اردو نے مختلف مزاہب کے ماننے والوں کو اور قریب کر دیا۔ نتیجتاً ہندو مسلم شعراء نے ایسے خیالات کا اظہار کیا جو بظاہر عقیدہ کے خلاف تھا اور نہ ہی دوسری مذاہب کی موافقت میں تھی ہندو شعراء نے مسلم مذہبی رسومات کا احترام کیا اور مسلمان شعراء نے ہندوؤں کے عقائد واصنام کی تعریف کی۔ اس بات کی مثالیں سیکڑوں شعراء کے یہاں دیکھنے کو ملتے ہیں۔

تسبیح تری زلف کوں کہتے ہیں اے صنم   یک تار دے کہ رشتہ زنار رکھوں

ولی دکنی

تب کا مشتاق جی ہے پھمن سوں   کشن سوں جب کہ رام رامی ہے

ولی دکنی

میر کے دین ومذہب کو اب پوچھتے کیا ہوان نے تو   قسقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

اب تو جاتے ہیں بت کدے سے میر   پھر ملیں گے اگر خدا لایا

میر تقی میر

یہ عظمت رہ کے زاہدان بتوں میں ہم نے پائی ہے   کہ کعبہ ہم کو لیتے نادر بت خانہ آتا ہے

امیر

اس طرح مسلم شعراء نے ہندو رسم رواج اور مذہبی عقائد کو اسلامی فقہہ سے اس خوش الوبی کے ساتھ جوڑا کہ اس میں حسن امتیاز پیدا ہوگیا ہے۔ نظیرا کبر آبادی نے کرشن جی کی تعریف وتعظیم میں مستقل نظمیں لکھ کر اور پرب وتہوار کا بکھان کر کے اردو کی قومی رواداری اور یک جہتی کی عمدہ مثال پیش کرتے ہیں دوسری طرف اردو کے ہندو شعراء نے بھی اسلام کے عقائد سے دلچسپی بلکہ عقیدت مندی کا اظہار شاعرانہ انداز یا روایتی طریق نے مخلوط تمدن اور صدیوں کے بھائی چارہ کی حقیقت باوجود اختلاف مذہب کے ہندو اور مسلمان طرز معاشرت وضع قطع بات چیت اور طرز فکر میں یکسانیت آج بھی موجود ہے جدو جہد آزادی کے زمانے میں اتحاد واتفاق کی ضرورتوں کو شدید طریقے سے محسوس کیا گیا۔

ہندو مسلم سکھ عیسائی   آپس میں سب بھائی بھائی

ہندو مسلم کے اس روایتی یک جہتی کو انگریزی سیاست نے مسخ کرنے کی کوشش کی جس کے نتیجہ میں حصول آزادی میں دونوں کا تقسیم یعنی ایک الگ مملکت کی قیام عمل میں آیا اور فسادات نے نفرتوں کو

مزید تقویت دی تو ظفر علی نے کہا۔

اگر کرشن کی تعلیم عام ہوجائے
تو کام فتنہ گروں کا تمام ہوجائے
نقش تہذیب ہنو داب بھی نمایاں ہے اگر
تو وہ سیتا سے ہے لچھمن سے ہے اور رام سے ہے

اس کے باوجود اس سے انکار نہیں کہ فرنگی سیاست نے جو نفاق کا بیج دونوں قوموں کے درمیان بویا تھا آج بھی اسکی شاخیں پھوٹتی رہتی ہیں لیکن اردو ہی ایک ایسی زبان ہے جس نے قومی یک جہتی کا عمدہ اور اعلیٰ مثال پیش کی ہے اردو زبان اور اس کا ادب دو قوموں کی آماج گاہ ہے اردو زبان وادب کی آبیاری میں جہاں ہندو شعراء نے اپنا خون پسینا ایک کر دیا وہیں مسلمان شعراء نے اردو کو اپنالائحہ عمل بنا لیا۔ اس طرح آزادی کے بعد بھی سماجی اور سیاسی کوچے میں ملک کی بقا کے لئے یک جہتی کی اہمیت افادیت محسوس کی جاتی رہی ہے علامہ اقبال نے جو محسوس کیا اس کو اردو کے قالب میں اس طرح ڈھالا کہ

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا ہندی ہیں ہم وطن ہیں ہندستاں ہمارا

اور یہ بھی دیکھئے؟

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

بسمل عظیم آبادی

شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی علامہ جمیل مظہری، پرویز شاہدی، فیض احمد فیض، حسرت موہانی، شکیل بدایونی، چکبست، پریم چند، فراق گورکھپوری، وغیرہ بلبل ہند نے دونوں قوموں کے درمیان مماثلت پیدا کرنے کی کوشش کی اس کی مثال کسی بھی دوسری زبان میں دیکھنے کو نہیں ملتی ہے انقلاب زندہ باد، کا نعرہ ہندوستان کے کونے کونے میں گونج رہا ہے چاہے وہ اردو جانتا ہو یا نہیں لیکن اردو کے اس نعرہ انقلاب کا شدت جذبات سے مغلوب ہو کر آج بھی پکار اٹھتا ہے ''سارے جہاں سے اچھا ہندستاں ہمارا۔'' بلا امتیاز مذہب وملت آج بھی پورے ہندوستان میں اردو بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اردو ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی نشانی ہے اور قومی یک جہتی کی علم بردار۔

☆☆☆

140/-